ماھنامہ

حکمت بالغہ

نومبر 2008

مدیر: انجینئر مختار حسین فاروقی

قرآن اکیڈمی

جھنگ پاکستان

فون اور فیکس: 0092-47-7628361

ای میل: hikmatbaalgha@yahoo.com

ویب سائٹ www.hamditabligh.net پر حکمت بالغہ کے تمام شمارے دستیاب ہیں

حرف آرزو

انجینئر مختار فاروقی

''امت مسلمہ'' آج دنیا میں گوناگوں مسائل کا شکار ہے اور عملاً ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ (رسوائی اور محتاجی ان سے چمٹا دی گئی) نہ دنیا ہی میں کوئی عزت و مقام ہے اور نہ مالک ارض و سماء کے ہاں کوئی عزت اور درجاتِ جنت ــــــــــــ اس پستی اور گراوٹ کی وجہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم مسلمانوں نے اپنے مقصد وجود کو بھلا کر اپنے مقام عز و شرف کو اپنے ہاتھوں سے گنوا دیا ہے یا بالفاظ دیگر ہم نے آخرت دے کر دنیا خرید لی ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو چھوڑ کر امریکہ اور فرینڈز آف پاکستان (FRIENDS OF PAKISTAN) سہارا تلاش کر لیا ہے۔ نتیجے کے طور پر ــــــــــــ حال نہیں مستقبل قریب میں بھی کسی شان و شوکت اور جاہ و جلال والے مقام و مرتبہ کی سبیل نظر آ رہی ہے اور نہ اللہ ہی ہم سے راضی ہے کہ آخرت میں بہتری کا یقین اور اطمینان ہو۔

''امت مسلمہ'' کا مقصد وجود نبوت و رسالت کے کامل ہونے کے بعد انقطاع کے نتیجے میں ہونے والے خلاء کو پُر کرنا تھا۔ اسی مقصد وحید کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس امت کو کھڑا کیا تھا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (3-110)

''(مؤمنو) جتنی امتیں (قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''

امتوں پر اضمحلال اور بے عملی کے دور آتے ہی رہے ہیں آخر انسانی معاشرہ ہے لیکن اگر ساری امت سو جائے تو بھی کچھ لوگ تو ایسے ہونے چاہئیں جو جاگتے رہیں اور باقی امت کو جگانے کا کام کریں اور اس کو احساس زیاں دلاتے رہیں تا آنکہ اللہ تعالیٰ کے اصولوں اور سنت الٰہی کے مطابق وہ وقت آ جائے کہ امت ''زندہ'' ہو جائے اور بیدار ہو جائے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (3-104)

''اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے یہی لوگ ہیں جو نجات پانے والے ہیں''

قرآن مجید میں انسانوں کی اجتماعی بے راہ روی اور آسمانی ہدایت سے بے اعتنائی کو انسانیت کی معنوی موت کہا گیا ہے جبکہ انسانوں کا آسمانی ہدایت کو قبول کر لینا اور انفرادی زندگی میں تقویٰ للّٰہیّت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی پیروی اور اجتماعی زندگی میں اصول حریت، اخوت و مساوات کو اپنا کر ''خلافت'' کے نظام کو اختیار کرنے کو اجتماعی زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کیفیت کو حدیث پاک میں احیائے اسلام کا نام دیا گیا ہے۔

یہ بات ایک تاریخ حقیقت ہے کہ جب کبھی ''امت مسلمہ'' نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام پر عمل کرتے ہوئے حقیقی ''امت مسلمہ'' (فرمانبردار لوگ) کا روپ دھارا ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں عزت و وقار بخشا ہے اور تمام جہان والوں پر فضیلت دے دی ہے اور جب کبھی امت مسلمہ نے اپنے مقصد وجود کو بھلا دیا اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام سے روگردانی کی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک طرف امت مسلمہ کو بے وقعت کر دیا اور دوسری طرف شیطانی قوتوں اور بے ضمیر اور بے حیا لوگوں کو سر اٹھانے کا موقع ملا ہے اور اس سے شیطانی تہذیب و تمدن نے جنم لیا ہے اور گمراہی کے فلسفوں اور غیر منطقی اور بے اصل باتوں کو ہی منطق اور اصل الاصول سمجھ کر اپنانے کی راہ اختیار کی گئی ہے۔

تاریخ عالم میں اس ''حق'' کی پہلی مثال 600 ق م سے لیکر 600 عیسوی تک کی ہے جبکہ بنی اسرائیل (یہود) نے اپنی شرارتوں کے باعث آگے بڑھ کر انبیائے کرام علیہم السلام کو قتل کرنے کا کام شروع کر دیا اور انہوں نے بہت سے پیغمبر اور راہ حق بتلانے والوں کو قتل کر دیا اور یوں آسمانی ہدایت کا ایک مصنوعی ''خَلا'' اور عملاً ایک مصنوعی انقطاع نبوت پیدا ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں شیطانی قوتوں اور بے راہ روی کے حامل انسانوں کو اپنی غیر فطری اور غیر منطقی باتیں چکنی چپڑی بنا کر پیش کرنے کا موقع مل گیا یہ سلسلہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے مزعومہ قتل یا صلیب (یا حقیقی معنٰی میں رفع آسمانی) تک جاری رہا بعد ازاں حکمت خداوندی میں آخری اور کامل نبی ﷺ کی آمد کی تمہید کے طور پر ایک ''انتظار'' کی کیفیت پیدا کرنا مقصود تھا تو چھ صدیوں کا وقفہ آ گیا۔

یہ چھ صدیاں قبل مسیح علیہ السلام اور چھ صدیاں بعد مسیح علیہ السلام کا دور ہے جس میں آسمانی ہدایت آہستہ آہستہ پس پردہ چلی گئی تورات کو جان بوجھ کر غائب کر دیا تھا اور انجیل کا اصل نسخہ بھی کسی نے چھپا لیا لہٰذا ــــــــــــ اہل علم جانتے ہیں کہ یہی وہ دور ہے جس میں پوری دنیا میں بالعموم فلسفیانہ مذاہب نے جنم لیا ہے اور شیطانی قوتوں نے انگڑائی لی ہے کہ انسانوں کو گمراہ کرنے کا موقع ملا ہے یونان میں افلاطون، ارسطو اور اس کی جماعت، ایران میں مانی اور ہندوستان میں چانکیہ وغیرہ کے فلسفے وجود میں آئے ہیں۔ اور انسانوں کی فطری کمزوریوں اور فطری رجحانات کو EXPLOIT کر کے اپنے بے راہ روی کے خیالات اور غیر منطقی باتوں کو منطقی بنا کر پیش کر کے آسمانی ہدایت سے دور کرنے اور انسانوں کو ''حیوان'' بنانے کا عمل شروع ہو کر پروان چڑھا ہے۔

اسی حق کی دوسری مثال ہدایت کے مہر تاباں اور حق کے علمبردار آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت کے دور میں آسمانی ہدایت کے منصّہ شہود پر آنے اور خلافت راشدہ کے دور مبارک میں سارے عالم میں روشنی کی کیفیت پیدا کرنے کے دور کی ہے جسے قرآن ''الضحیٰ'' سے تعبیر فرماتا ہے جب فلسفیانہ اور گمراہ کن نظریات جو انسانی فطرت کی مسخ شدہ

کیفیت کا نام ہے اور ایسے ہی لوگوں کی ذہنی کیفیتوں کی عکاسی کرتے ہیں ''غائب'' ہو گئے اور جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (17-81) (حق آ گیا اور باطل نابود ہو گیا بے شک باطل نابود ہونے والا ہے) کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اگر چہ دنیا میں خیر و شر کا معرکہ کبھی ختم نہیں ہوا اور ہمیشہ بھیس بدل بدل کر جاری رہتا ہے اور ''گر چہ پیر ہے آدم، جواں ہے لات و منات'' تاریخ انسانی کی چند حرفی تعبیر ہے دور خلافت راشدہ کے دوران اور اس کے بعد بھی شیطانی قوتوں یا ''حزب الشیطان'' نے ہار نہیں مانی بلکہ در پردہ اپنی ریشہ دوانیوں اور سازشوں (پھونکوں) سے اسلام اور آسمانی ہدایت کی روشنی کو ختم کرنے کا کام پوری مستعدی سے جاری رہا ہے تاہم یہ بات ''الحق'' ہے جریدہ عالم پر حرف انمٹ کی طرح ثبت ہے کہ آپ فلسفیانہ مذاہب کے بانیاں اور ان کے نمایاں پیروکاروں اور اوّلین شارحین، مبلغین کی فہرست ترتیب زمانی کے اعتبار سے دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ۔

انسانی جبلتوں اور سفلی خواہشات کی تکمیل کے داعی شیطانی اور ابلیسی نظریات کا وہ دور نامسعود جو 600 ق م میں بنی اسرائیل کے گھناؤنے جرم ''قتل انبیاء'' (جس کا تذکرہ بائیبل کے عہد نامہ عتیق میں بھی ہے) کی وجہ سے اور تورات کے گم کر دینے کی وجہ سے آسمانی ہدایت کے ''خلا'' کے دور میں شروع ہوا اور پروان چڑھا اور تمام فلسفیانہ مذاہب کے بانیان اسی دور کے ہیں چاہے وہ ہندوستان ہو یا ایران یا یونان اور چین ــــــــــــ اور یہ سلسلہ 600 عیسوی تک جاری رہا ہے۔

جبکہ حضرت محمد ﷺ کی تشریف آوری کے بعد اور اسلام کے روئے ارضی پر چھائے رہنے کے دور تک (400ھ 1000ء) کوئی بڑا فلسفی یا فلسفیانہ مذہب کا بانی دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ حقیقت کے قریب ہو گا کہ عقل عام کو آسمانی ہدایت کے غلبہ اور استیلاء کے دور میں حق کے خلاف سوچنے اور دلائل دینے کی جرات ہی نہیں ہوئی۔

جب مسلمانوں ہی میں ایمانی کیفیات میں مجموعی کمی آ گئی اور جذبات اور احساسات میں وہ شوق باقی نہ رہا اور جذب دروں کی کیفیت ختم ہو گئی تو آہستہ آہستہ ان بے راہ روی کے خیالات کو سر اٹھانے کا موقع پھر مل گیا اور ــــــــــــ اس دور میں بھی ارسطو و

افلاطون کے خیالات کے پرچارک مسلمانوں میں ہی سامنے آئے ہیں غیر مسلم دنیا میں وہ دم خم نہیں تھا کہ اسلام کی حقانیت کی عمومی فضا میں آسمانی ہدایت کی کاٹ کر کے کوئی باطل نظریہ پروان چڑھا سکے۔

چنانچہ یہی دور ہے جس میں مسلمانوں ہی میں یونانی نظریات کے شارحین اور مبلغین پیدا ہوئے فارابی ابن سینا، ابن رشد وغیرہ اسی دور کے بڑے بڑے نام ہیں۔

مسلمانوں میں جب باطنی، ایمانی کیفیات میں اضمحلال کے بعد سیاسی زوال آ گیا اور 1258ء میں سقوط بغداد ہو گیا تو اس کے بعد وہ دور ہے کہ غیر مسلم دنیا میں کچھ حرکت ہوئی اور آسمانی ہدایت کے مقابلے میں اپنی سوچ اور آراء کے سامنے لانے کا آغاز ہوا ہے۔

آسمانی ہدایت سے عاری بلکہ مخالف اس مہم جوئی میں سب سے زیادہ سازگار ماحول سپین کی یونیورسٹیوں سے زیور تعلیم سے آراستہ ہو کر آنے والے یورپی دماغوں کو اپنے ملکوں میں ملا جہاں بیٹھ کر انہوں نے انسان کے اپنے فطری رجحانات اور میلانات کے خلاف صرف حیوانی جذبات اور جبلتوں کے زور پر صرف حیوانیت کے تقاضوں کی تکمیل کی خواہش کے تحت آگے بڑھنے کی سوچ کو ''جدید سوچ'' اور ''احیائے علوم'' کا نام دے کر آگے بڑھایا اور ہوتے ہوتے گزشتہ چھ صدیوں کی محنت شاقہ اور بنی اسرائیل کے دونوں گروہوں یہود و نصاریٰ کے تعاون سے معاملہ اب یہاں تک پہنچا ہے کہ آج کی مغربی تہذیب جس نے مذہب بیزاری اور خدا ناشناسی کا یہ سفر طے کر کے بیسویں صدی میں انسان کو کامل حیوان بنا دیا ہے اور شرف انسانی کے معیار ''شرم و حیا'' اور ''ضمیر'' اور ''نیکی بدی کے احساس'' (MORAL LAW) کو بالارادہ اور بامقصد منصوبہ بندی سے ختم کر دیا ہے اور اب گزشتہ نصف صدی میں ایسی دو تین نسلیں (GENERATIONS) میدان عمل میں آ چکی ہیں جو دیکھنے کو اب انسان ہی ہیں۔ تاہم باقی ہر اعتبار سے ''کالانعام'' جانور اور BEAST ہیں اور ہر قسم کے اخلاق ضابطوں سے عاری بلکہ مخالف ہیں۔

یہی نسل ہے جس کے ہاتھ میں آج مغرب کی اقوام کی زمام کار ہے اور معاملات کو

چلا رہی ہے اور اگلی نسل یقیناً موجودہ قیادتوں سے بھی زیادہ غیر معقول اور حیوانیت (BEASTALITY) میں بے باک ہوگی۔

اس حزب الشیطان یعنی مغربی قوتوں نے سارے کرّ وفرّ کے ساتھ تیسری ہزاری (THIRDMILLIONEUM) میں قتل انبیاء علیہم السلام اور تورات اور انجیل کو غائب کرنے کی طرح کے اقدامات شروع کئے ہیں اور اس ناپاک مقصد کے حصول کے لئے کئی محاذ کھول دیئے ہیں۔توہین رسالت ایک محاذ ہے،توہین قرآن دوسرا محاذ ہے،اسلامی سزاؤں کی تحقیر اور اس کے خلاف پراپیگنڈہ ،تیسرا محاذ ہے''آزادی نسواں'' کے نام پر تحریک جس سے انسانی شرف کو ختم کر کے جنسی طور پر انسان کو حیوان کی سطح پر لے آیا جائے اور اس کے نتیجے میں چادر اور چار دیواری یا''خاندان'' کا نظام تباہ کرنا مقصود ہے یہ خاندانی نظام مغرب میں تباہ ہو چکا ہے اب پوری دنیا میں یہ محاذ کھول دیا گیا ہے دیگر مذاہب کا خاندانی نظام اتنا مزاحم نہیں ہے صرف اسلام کا خاندانی نظام اور قانون نکاح وطلاق جو ابھی تک جاری(INTACT) ہے اس کو مسلسل مختلف حیلوں بہانوں سے ختم کیا جارہا ہے۔۔

چوتھا محاذ میڈیا کی سطح پر ہے کہ مسلمانوں کے خلاف اس مشترکہ عالمی مہم جوئی میں جو مسلمان غیرت ایمانی اور اسلامی سے مزاحمت کرے اسے''دہشت گرد'' قرار دیا جائے اور نفرت کا نشانہ بنا دیا جائے۔پوری دنیا کا پرنٹ میڈیا اور الیکڑانک میڈیا مسلسل یہی''قوالی'' کررہا ہے اور یہی راگ الاپ رہا ہے۔

پانچواں محاذ سیاسی اور عسکری سطح پر ہے کہ مسلم ممالک کی عسکری قوت اور ایٹمی قوت کو ختم کر دیا جائے چنانچہ لیبیا،عراق، پاکستان پر یلغار جاری ہے اور ان شیطانی اور ابلیسی قوتوں کے ارادے یہ ہیں کہ یہ یلغاران کے ناپاک عزائم کی تکمیل تک جاری رہے گی۔

نائن الیون(9/11) کے واقعہ کے بعد سے جاری جنگ میں امریکہ سمیت سارے یورپی ممالک اور دیگر امریکی اتحادی شریک ہیں گزشتہ سالوں کے دوران تہذیب مغرب نے

اپنی نیک نامی کے لئے جو چند تمغے بار بار دنیا کے سامنے رکھے وہ جمہوریت، آزادی اور سرمایہ داری کا نظام تھا۔ سوشلزم اور کمیونزم کا سورج 1989ء میں پہلے ہی غروب ہو چکا ہے۔

ان سالوں میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے جمہوریت اور جمہوری اقدار کا جس طرح حلیہ بگاڑا ہے اس کی کوئی مثال ملنا مشکل ہے عوام کی رائے، آزادی رائے آزادی اظہار رائے، آزادی مذہب غرض سب اصول طاق نسیان ہو گئے۔ آزادی بھی فوجی بوٹوں کے نیچے کچل دی گئی علامہ اقبال مغربی جمہوریت کی اس صورتحال کا ایک صدی پہلے مشاہدہ کر آئے تھے۔

دیو استبداد ہے جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے اسے آزادی کی نیلم پری

اور سرمایہ داری (CAPITALISM) گزشتہ چند سالوں کے بحرانوں کے نتیجے میں روبہ زوال ہے اور علامہ اقبال جیسے مرد قلندر ہی کی پیش گوئی پوری ہونے کا وقت آ گیا ہے۔

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تیری منتظر اے روز مکافات

حالیہ دنوں کی اخباروں کی سرخیاں عراق اور افغانستان میں امریکی اتحادیوں کی شکست فاش اور فرار کا عندیہ دے رہی ہیں اور پاکستان پر غصہ والی نگاہیں بھی در پردہ افغانستان میں ناکامی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ تاہم امریکہ جیسی سپر پاور کا ختم ہونا بھی وقت لے جائے گا اور اردو محاورے ''جاٹ مرا جب جانیے جب دسواں ہو'' کے مصداق امریکہ کا افغانستان و عراق سے نکلنا اور سرمایہ دارانہ نظام کی تباہی اپنے آخری دموں پر ہونے کے باوجود کچھ وقت لے سکتی ہے۔

ان حالات میں امریکہ اور اس کے یورپی اتحادی تو واپس گھروں کو لوٹ جائیں گے اور ''پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا'' والی بات پوری ہو جائے گی مگر ــــــــــــــ امریکہ کے ایک خود ساختہ اتحادی بھارت کا معاملہ مختلف ہے اور امریکہ کے بل بوتے پر

پاکستان پر برتری دکھانے والے ملک کا حال اگلے چند سالوں میں بڑا قابل رحم ہوگا۔ پہلے بھی بھارت 1971,1965ء وغیرہ میں روس اور امریکہ کی شہ پر اور اس کی در پردہ حمایت کی وجہ سے ہی جنگ لڑ سکا ہے مگر اب جو صورت حال پیدا ہوگی وہ بہت غور طلب ہے اور اہل علم اور ارباب حل وعقد کے لئے آزمائش۔

جو حضرات دینی ذوق رکھتے ہیں اور قرآن مجید اور سیرت النبی ﷺ کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں ان کے لئے اس صورتحال کا تجزیہ FOOD FOR THOUGHT کے درجے کی چیز ہوگی۔

کہ ــــــــــــ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے انخلاء کے بعد بھارت بالکل اسی کیفیت میں چلا جائے گا جو جنگ خندق کے موقع پر 5 ہجری میں مشرکین مکہ کے اتحادیوں نے پیدا کر دی تھی مگر جنگ خندق میں مشرکین مکہ اور ان کی اتحادی قوتوں کی ناکامی کے بعد یہود کے قبیلہ بنی قریظہ کی کیفیت دیدنی تھی۔ سارے اتحادی گھروں کو لوٹ چکے تھے اور نبی اکرم ﷺ بنی قریظہ کے ٹھکانوں پر فوج لیکر پہنچ چکے تھے۔ بنی قریظہ نے میثاق مدینہ کے باوجود مسلمانوں اور نبی اکرم ﷺ کے خلاف مشرکین کا نہ صرف ساتھ دیا بلکہ ان کو مدینہ پر حملہ کے لئے ہر قسم کی مدد دینے کا وعدہ کر کے حملہ کی راہ ہموار کی تھی۔

اس فوج کشی میں بنی قریظہ نے ہتھیار ڈال دیئے اور ثالثی کے فیصلے میں سزا پائی جو نافذ العمل ہوئی۔

اسی طرح 6 ہجری میں صلح حدیبیہ کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے صلح حدیبیہ میں مشرکین مکہ سے 10 سال کا معاہدہ صلح کیا ــــــــــــ تو اب یہود جزیرہ نمائے عرب میں بالکل تنہا ہو گئے اور اس کے باوجود اپنی سازشوں سے باز نہ آنے پر سزا کے مستحق ٹھہرے لہٰذا نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ نے صلح حدیبیہ کے فوراً بعد خیبر پر حملہ کر کے یہود کے اس محفوظ ٹھکانے کو فتح کر لیا اور انہیں تتر بتر کر دیا اور ان کی متحدہ طاقت کو ختم کر کے رکھ دیا۔

بعینہ ــــــــــــ یہی صورت حال امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی گھر ''بخیر و عافیت'' واپسی ہوگی جبکہ بھارت تنہا رہ جائے گا اور چاروں طرف سے اس کا کوئی بظاہر حمائتی

ملک نہیں ہوگا۔ پڑوسی ممالک یعنی سارک ممالک سے اس کی دشمنی اور ریشہ دوانیوں کی تاریخ عیاں ہے۔ جبکہ مسلمانان عالم کا بالعموم اور افغانستان اور پاکستان کے مسلمانوں کا بالخصوص مورال روس اور امریکہ دو سپر پاورز کے دانت کھٹے کرنے اور شکست وریخت سے دوچار کرنے کے باعث انتہائی بلندیوں کو چھو رہا ہوگا۔

لہٰذا ــــــــــــ یہ موقع ہوگا پاکستان کے لئے کہ بھارت کے ساتھ گزشتہ ساٹھ سال کی تاریخی مخاصمت اور اس کی زیادتیوں کا بدلہ لے سکے۔ سقوط حیدرآباد، کشمیر پر قبضہ اور پاکستان کو قحط سے دوچار کرنے کے اقدامات کا جواب دینے کا۔

اس کا نقشہ فرمان رسالت ﷺ میں غزوۃ الہند نامی ایک جنگ اور اس میں مسلمانوں کی کامیابی کی نوید کی صورت میں کھینچا ہے۔

عِصَابَتَانِ مِنْ اُمَّتِیْ اَحْرَزَهُمَا اللّٰهُ مِنَ النَّارِ: عِصَابَةٌ تَغْزُو الْهِنْدَ وَعِصَابَةٌ تَكُوْنَ مَعَ عِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ علیہماالسلام (سنن النسائی عن ثوبانؓ)

''میری امت میں سے دو گروہ ایسے ہوں گے جنہیں اللہ تعالیٰ آگ سے بچالے گا: ایک گروہ جو ہندوستان سے جہاد کرے گا اور دوسرا گروہ جو حضرت عیسیٰ بن مریم علیہاالسلام کا ساتھ دے گا''

اغلباً اسی طرح کی سیاسی تبدیلی مشرق وسطی میں بھی مستقبل قریب میں پیدا ہو کر رہے گی جس کی خبر اس فرمان رسالت میں دی گئی ہے مت مسلمہ کے بہی خواہاں، زعماء، مجاہدین، اکابرین، علماء اور عالی دماغ دانشوروں کو اس آنیوالے حالات کی تیاری رکھنی چاہئے

فرمانِ خداوندی

آیات10-7

_ ^] \ [Z Y X

جو مال اللہ نے اپنے پیغمبر کو دیہات والوں سے دلوایا ہے

c b a `

وہ اللہ کے اور پیغمبر کے اور (پیغمبر کے) قرابت والوں کے

g f e d

اور یتیموں اور حاجت مندوں اور مسافروں کے لئے ہے

n m l k j i h

تاکہ جو لوگ تم میں دولت مند ہیں انہیں کے ہاتھوں میں نہ پھرتا رہے

s r q p

اور جو چیز تم کو پیغمبر دیں وہ لے لو

x w v u t

اور جس سے منع کریں (اُس سے) باز رہو

{zy

اور اللہ سے ڈرتے رہو

i - , } |

بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے

£ ¢

اوران مفلسان تارکِ وطن کے لئے بھی

¨ § ¦ ¥ ¤

جواپنے گھروں اور مالوں سے خارج (اور جدا) کر دیئے گئے ہیں

® ¬ « ª ©

وہ اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلب گار

± ° ¯

اور اللہ اور اُس کے پیغمبر کے مددگار ہیں

¶ µ ´ ³

یہی لوگ سچے (ایمان دار) ہیں

½ ¼ » º ¹ ¸

اور (ان لوگوں کے لئے بھی) جو مہاجرین سے پہلے (ہجرت کے) گھر

(یعنی مدینے) میں مقیم اور ایمان میں (مستقل) رہے

Á À ¿ ¾

(اور) جو لوگ ہجرت کر کے ان کے پاس آتے ہیں ان سے محبت کرتے ہیں

È Ç Æ Å ÄÃ Â

اور جو کچھ اُن کو ملا اس سے اپنے دل میں کچھ خواہش (اور خلش) نہیں پاتے

Ë Ê É

اور ان کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں

Ð Î Í Ì

خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو

Ô Ó Ò Ñ

اور جو شخص حرصِ نفس سے بچالیا گیا

Ø × Ö Õ

تو ایسے ہی لوگ مراد پانے والے ہیں

% $ # " !

اور (ان کے لئے بھی) جو ان (مہاجرین) کے بعد آئے (اور) دعا کرتے ہیں کہ

, + *) (' &

اے پروردگار! ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے جو ہم سے

پہلے ایمان لائے ہیں' گناہ معاف فرما

3 2 1 0 / . -

اور مؤمنوں کی طرف سے ہمارے دلوں میں کینہ (وحسد) نہ پیدا ہونے دے

9 8 7 6 5 4

اے ہمارے پروردگار تو بڑا شفقت کرنے والا مہربان ہے

مکاشفاتِ اقبال

پاکستان 14۔اگست 1947ء بمطابق 27رمضان المبارک 1366ھ کو معرض وجود میں آیا۔عالمی نقشہ پر یکا یک ایک نئے ملک کا ایک نئے نام کے ساتھ منصّہ شہود پر آ جانا ایک معجزہ سے کم نہیں تھا۔اس لئے کہ اس نام کا کوئی ملک پہلے موجود ہی نہیں تھا اور نہ تاریخ میں کبھی رہا۔

چند ماہ پہلے برطانوی پریس میں تقسیم ہند سے متعلق خفیہ دستاویز کی رونمائی کے حوالے سے یہ بات سامنے آ چکی ہے جس کی بازگشت ہمارے پریس میں سنی گئی کہ برطانیہ اور ہندو کانگرس متحدہ ہند کے علمبردار تھے اور اکثر مسلم زعما بھی ان کے ہمنوا ہو جاتے مگر ایک زندہ دل اور بیدار مغز شاعر علامہ محمد اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے مسلمانان ہند میں وہ جذبہ پھونکا کہ عالمی استعمار کو برطانوی ہند تقسیم کر کے مسلمانوں کو علیحدہ وطن دینے پر مجبور ہو گیا۔برطانوی ہند میں بیسویں صدی کے آغاز میں مغرب کا ہمہ گیر غلبہ تھا اور عالمی سطح پر بھی اس کی اجارہ داری تھی برطانوی فلسفی برٹرینڈ رسل لکھتا ہے کہ بیسویں صدی کی پہلی دہائیوں میں برطانوی عوام میں یہ احساس عام تھا کہ برطانیہ کا عالمی اقتدار کبھی ختم نہیں ہو گا مگر تاریخ نے اس قوم کا اقتدار نصف صدی کے اندر ہی خاک میں ملا دیا اور اس میں علامہ اقبال کی ملّی شاعری کو بڑا دخل ہے جس نے امت مسلمہ کے ناتواں جسم میں شاہین کا جگر پیدا کر دیا تھا۔علامہ اقبال کا VISSION اور گہرا یقین ہی ان کی شاعری کی جان ہے اور یہ گہرا یقین ــــــــــــ ''من میں ڈوب کر'' ہی ملتا ہے۔مکاشفات اقبال میں مضمون نگار نے علامہ اقبال کی شخصیت کے اس پہلو پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے جس کی بنا پر مسلمانان ہند کو اللہ تعالیٰ نے شب قدر میں قرآن مجید کے جلو میں مقدس جذبوں اور بے لوث قربانیوں میں لپیٹ کر یہ پاکستان کا تحفہ عطا کر دیا۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حقیقی معنوں میں اسے پاک سرزمین بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔(آمین) ادارہ

یہ مضمون ماہنامہ میثاق لاہور اکتوبر 08ء کے شمارے سے ہدیہ قارئین کر رہے ہیں۔

مکاشفاتِ اقبال

قیامِ پاکستان اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ

مظفر حسین

علامہ اقبال ایک شاعر اور فلسفی ہونے کے علاوہ ایک حقیقت پسند سیاسی مفکر تھے اور انہوں نے سیاست میں عملاً بھی حصہ لیا، لیکن یہ ان کی شخصیت کے اضافی پہلو ہیں۔ بنیادی طور پر وہ ایک روحانی شخصیت تھے اور انہیں اس بات کا پختہ یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عصر حاضر میں امت مسلمہ کی رہنمائی کا فریضہ سونپا ہے اور وہ خدا کی طرف سے مسلمانوں کے عروج اور ترقی کا خاص پیغام لے کر آئے ہیں۔ ؎

بے نیازانہ ز شوریدہ نوائم مگزر
مرغ لاہوتم از دوست پیامے دارم

''میری شاعری کو ایک جنونی کی باتیں کہتے ہوئے بے نیازی سے مت گزر جاؤ۔ میں طائر لاہوتی ہوں اور تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کا پیغام لایا ہوں''۔ ؎

پیر گردوں بامن این اسرار گفت
از ندیماں رازہا نتواں نہفت

''اللہ تعالیٰ نے یہ اسرار مجھ پر الہام کئے ہیں اور میں نے ان اسرار کو اپنے دوستوں سے چھپایا نہیں ہے''۔

اپنے بارے میں یہ غیر معمولی اعتماد ان کے دور روحانی مکاشفات پر مبنی ہے جو انہیں 1907ء اور 1923ء میں پیش آئے اور جن کی طرف آپ نے سید ظفر الحسن کے نام اپنے خط مورخہ 6۔ اگست 1932ء میں ان الفاظ کے ساتھ اشارہ کیا ہے۔

''مجھے پچیس سال ہوئے جب اس کا احساس ایک عجیب و غریب طریق میں ہوا۔ اس وقت میں انگلینڈ میں تھا۔ اس کے بعد ہندوستان میں اس کا اعادہ ہوا۔ اس کو اب کئی سال گزر چکے ہیں''۔

پہلا مکاشفہ مارچ 1907ء میں قیام لندن کے دوران ہوا۔ جس میں آپ نے قدسیوں کی زبانی سنا کہ قدرت کی طرف سے امت مسلمہ کو دوبارہ عروج عطا ہونے والا ہے۔ سید

نذیر نیازی مرحوم سے آپ نے اس مکاشفہ کی تفصیلات بھی بیان کی تھیں۔ جس کا بدقسمتی سے کوئی تحریری ریکارڈ موجود نہیں، البتہ ایک غزل میں اس کا برملا اظہار ملتا ہے۔ جو ''بانگ درا'' میں شامل ہے اور یہ واحد غزل ہے جس پر بطور ''عنوان'' مارچ 1907ء کی تاریخ ثبت ہے اس غزل میں وہ اپنے مکاشفہ کے حوالے سے فرماتے ہیں۔

؎ نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

اسی غزل میں انہوں نے مسلمانان ہند کی رہنمائی کیلئے اپنے عزم کا واشگاف اعلان کیا ہے

؎ میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

نیز اسی غزل میں ان کے اس یقین کا اظہار بھی موجود ہے کہ ان کا درماندہ کارواں تمام تر مشکلات کے باوجود بالآخر کامیابی سے ہمکنار ہوگا۔

؎ سفینۂ برگِ گل بنالے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا

علاوہ ازیں نظم 'طلوع اسلام' کے ابتدائی بند میں دوبارہ اسی پیش گوئی کو بڑے زوردار انداز میں پیش کیا ہے۔

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا سے ہی ہے گوہر کی سیرابی
عطا مؤمن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہن ہندی، نطقِ اعرابی

مارچ 1907ء کی مکاشفاتی غزل کے سولہ سال بعد چوہدری محمد حسین کے نام اپنے

ایک مکتوب مورخہ 30۔اگست 1923ء میں علامہ اقبال نے اپنے دوسرے روحانی مکاشفے کا ذکر کیا ہے جس میں آپ نے لکھا ہے کہ عالمِ بالا میں قدسیوں میں یہ شور مچا ہوا ہے کہ مسلمانوں کو فتح اور کامرانی نصیب ہونے والی ہے، لیکن زمین کے باسیوں کو اس کی کچھ خبر ہی نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

" THRER IS A LOT OF ENTHUSIASM ON HEAVENS IN RESPECT OF THE VICTORY OF THE MUSLIMS BUT THOSE ON EARTH ARE SILENT. MAY GOD HAVE PITY ON THEM. OUR RELIGIOUS SCHOLARS AND SAINTS TURNED ISLAM INTO AN ANCIENT ASIAN CREED."

''عالم بالا میں مسلمانوں کی فتح ونصرت کے بارے میں بڑا جوش وخروش ہے، لیکن ساکنانِ زمین مہر بلب ہیں۔ خدا ان کے حال پر رحم فرمائے۔ ہمارے علماء وصلحاء نے اسلام کو ایک قدیم ایشیائی مذہب بنا کر رکھ چھوڑا ہے''۔

علامہ اقبال کو اس بات کا بہت دکھ تھا کہ ہمارے علماء وصلحاء نے اسلام کی جدیدیت کا احساس نہیں کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص صرف انہی لوگوں کی تحریروں پر انحصار کرتے ہوئے اسلام کا مطالعہ کرے اور اس بات کو پیش نظر نہ رکھے کہ اسلام آج سے چودہ سو سال پہلے آیا تھا تو کبھی اس حقیقت سے آشنا نہیں ہوسکتا کہ اسلام کس قدر جدید مذہب ہے۔ چنانچہ وہ اس خط میں لکھتے ہیں:

" IF ONE STUDIES ISLAM THROUGH THE WRITINGS MUSLIMS NOT KNOWING THAT ISLAM'S ADVENT TOOK PLACE THIRTEEN HUNDRED YEARS AGO, HE WILL NOT REACH THE CONCLUSION THAT ISLAM IS SUCH A MODERN RELIGION. I AM SORRY THAT

MUSLIMS HAVE NEVER RECOGNISED THE MODERNITY OF QURAN. THEY INSTEAD HAVE INTERPRETED ITS SUBJECT AND TRUTHS IN LIGHT OF ANCIENT PEOPLES AND THUS HAVE MUTILATED ITS REAL SENSE AND INTENT."

''اگر کوئی شخص یہ نہ جانتا ہو کہ اسلام آج سے تیرہ سو سال پہلے آیا تھا، اور اسلام کا مطالعہ ان کی لکھی ہوئی کتابوں کی روشنی میں کرے، تو کبھی اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا کہ اسلام اس قدر جدید مذہب ہے مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ مسلمانوں نے کبھی قرآن کی جدیدیت کا احساس نہیں کیا اس کے برعکس انہوں نے قرآن کے موضوع اور حقائق کی تشریح قدیم اقوام کی روشنی میں کر کے اس کے اصل مفہوم اور مدعا کو ہی مسخ کر ڈالا''۔

علامہ اقبال کے خط کی ان مندرجات سے جہاں یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ انہیں اس بات کا پختہ یقین تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو دوبارہ عروج حاصل ہوگا وہاں وہ اس بات پر بھی سخت رنجیدہ اور دل گرفتہ تھے کہ مسلمانوں نے قرآن کی جدیدیت کا احساس نہیں کیا ہمارے علماء کی لکھی ہوئی تفاسیر قرآن عصر حاضر کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسائل کا حل پیش نہیں کرتیں اور صدیوں پرانے حالات وواقعات کے بیان سے آگے ان کے پاس کچھ کہنے کو باقی نہیں رہتا۔

علامہ اقبال نے قرآن حکیم کا مطالعہ عصر حاضر کے تقاضوں کی روشنی میں کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اسلام کا مطمح نظر کشور کشائی ہرگز نہیں، بلکہ وہ اپنی اعلیٰ معاشی اور جمہوری اقدار کی اساس پر معاشرہ کی تشکیل وتنظیم کے ذریعے تسخیر قلوب کا مطمح نظر رکھتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے نکلسن کے نام اپنے خط میں لکھا تھا:

''مجھے پورے وثوق کے ساتھ یقین ہے کہ علاقوں کی فتح اسلام کے اصل پروگرام کا حصہ نہیں ہے، اور میرے خیال میں کشور کشائی کی مہم سے اسلام کی قلوب کو مسخر کرنے والی عالمگیر انسانی اخوت کو بے حد نقصان پہنچا اور اس نے معاشرہ میں جمہوری اور

معاشی نظم پیدا کرنے اور نشو ونما دینے والی ان کونپلوں کو نوچ ڈالا جو مجھے قرآن و حدیث کے صفحاتِ مقدسہ میں جابجا بکھری نظر آتی ہیں''۔

اپنے مکاشفات کی بنا پر علامہ اقبال کا خیال یہ تھا کہ ہندی مسلمانوں کو عصر حاضر میں جب اپنی ایک آزاد منظّم ریاست قائم کرنے کا موقع ملے گا تو وہ قرآن کی جدیدیت کو بروئے کار لا کر ایک جدید اسلامی ریاست قائم کر سکیں گے۔ چنانچہ خطبہ الٰہ آباد میں انہوں نے جب پاکستان کا نام استعمال کئے بغیر ہندوستان میں ایک آزاد مسلم ریاست کے قیام کا تصور پیش کیا تو اس میں واشگاف الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ:

''اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عرب امپیریلزم کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب وتمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب ہو جائے گا''۔

اسلام کے صحیح معانی کی تجدید اور زمانہ حال کی روح سے قریب تر ہونے کیلئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ قرآن کی تشریح وتفسیر کے ذریعے دور حاضر کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسائل کا حل پیش کیا جائے اسی چیز کو علامہ اقبال'' قرآن کی جدیدیت'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ چوہدری محمد حسین کے نام محولہ بالا خط کے آخر میں آپ لکھے ہیں کہ مسلمان قوم کی نشاۃ ثانیہ تو سیاسی آزادی ملنے سے حاصل ہو جائے گی لیکن اس کے بعد اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی ضرورت ہے جس کے لئے ایک ایسے مفسرِ قرآن کی ضرورت ہے جو قرآن کی جدیدیت کو واضح کرے اور قرآن کی حکمت گمشدہ مسلمانوں کو لوٹا دے۔

"NOW ALONGWITH THE RENAISSANCE OF MUSLIM COMMUNITIES THE RENAISSANCE OF ISLAM IS ALSO NEEDED. I PRAY TO GOD ALMIGHTY THAT HE, FOR THE SAKE OF HIS BELOVED, THE PROPHET(PBUH) PRODUCES

SUCH AN INTERPRETER AMONG MUSLIMS WHO GETS AT THE LOST WISDOM ONCE MORE AND OFFERS IT TO UMMAH. OUR DEMISE IS NOT NEAR AT HAND, THE QURAN STILL HOLDS ON."

''اب مسلم اقوام کی نشاۃِ ثانیہ کے ساتھ ساتھ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ بھی درکار ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک رسول اللہ ﷺ کے طفیل مسلمانوں میں ایک ایسا مفسر قرآن پیدا کرے جو اس کی ''گمشدہ حکمت'' امت مسلمہ کو لوٹا دے۔ ہمارا خاتمہ قریب نہیں (کیونکہ) قرآن آج بھی ہمارا رہنما اور کفیل ہے''۔

چوہدری محمد حسین کے نام خط کا یہ آخری حصہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے' کیونکہ اس میں علامہ اقبال نے مسلمانانِ ہند کی نشاۃِ ثانیہ اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کو الگ الگ شمار کرتے ہوئے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کو قرآن حکیم کی جدیدیت کے ساتھ مشروط کیا ہے۔

قیام پاکستان

علامہ اقبال کے مکاشفات کے عین مطابق سیاسی آزادی اور قیام پاکستان کی صورت میں قومی نشاۃ ثانیہ کی بات تو پوری ہوگئی، لیکن اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے سلسلہ میں علامہ اقبال کا خواب ہنوز تشنۂ تعبیر ہے جو قرآن کی ''جدیدیت'' کو بروئے کار لانے سے ہی پورا ہوسکتا ہے۔

مولانا مودودی نے فرمایا تھا کہ اسلامی فکر کا موجودہ سرمایہ ہماری کفایت نہیں کرتا' کیونکہ یہ ہزار سالہ پرانی زبان میں ہے جسے دور حاضر کا نوجوان سمجھ نہیں سکتا اور ہزار سالہ پرانی زندگی سے تعلق رکھتا ہے جو آج کہیں موجود نہیں اور جو لوگ حکومت الٰہیہ قائم کرنے کا نام لیتے ہیں انہیں اگر کسی خطہ میں اسے قائم کرنے کا موقع مل جائے تو ناکام ہوں گے' کیونکہ دور جدید میں اسلامی ریاست قائم کرنے کے لئے جو فکری سرمایہ درکار ہے وہ ہمارے پاس موجود ہی نہیں۔

اگر مولانا مودودی اور دیگر علماء اپنی زندگی یہ فکری سرمایہ فراہم کرنے کے لئے وقف کر دیتے تو پاکستان میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے امکانات بہت روشن ہو جاتے۔ لیکن انہیں یہ خطرہ محسوس ہوا کہ ترکی کو مثال بنا کر پاکستان میں بھی سیکولرزم قدم جما لے گا۔ اس لئے انہوں نے عملی

سیاست میں حصہ لینے کو ترجیح دی اور اپنے اصل کام سے غافل ہو گئے ان کی دیکھا دیکھی دوسرے مہم جو علماء نے بھی دین کے نام پر سیاسی جماعتیں قائم کر کے 'دین' اور ''سیکولرزم'' کی کشمکش کو ہوا دی جس کی وجہ سے ملک میں ایک خاص قسم کی ''سیاسی برہمنیت'' کو فروغ ملا اور علماء کے مطالبہ نفاذ اسلام کو تھیا کریسی کے نفاذ کے مترادف سمجھا جانے لگا۔ فرقہ پرست دینی جماعتوں نے جب اپنی اپنی فقہ کے نفاذ کو سیاسی مطمحِ نظر قرار دیا تو اسلام کو ایک وحدت خیز قوت کے بجائے انتشار انگیز سیاسی عامل سمجھا جانے لگا اور قومی اتفاق رائے نہ ہونے کی وجہ سے نفاذ اسلام کی منزل دور سے دور ہوتی چلی گئی۔

علامہ اقبال کی آرزو کے مطابق اگر قرآن کی جدیدیت کو بروئے کار لایا جاتا تو پاکستان میں اسلام اور سیکولرزم کی بحث ہی نہ چھڑتی۔ لیکن ہمارے دینی رہنماؤں نے آج تک اس بات کا احساس نہیں کیا کہ سیاسی میدان میں ''سیکولرز عناصر'' سے اقتدار چھیننے سے زیادہ فکری محاذ پر انہیں مسخر کرنے کی ضرورت ہے اور یہ کام قرآن کی جدیدیت کو برائے کار لائے بغیر ممکن نہیں

ہمارے علماء اسلام کو ''قدیم ایشیائی مذہب'' کی حیثیت سے دیکھنے کے عادی ہیں اور اجتہادی بصیرت سے محروم ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ ''خطباتِ بہاولپور'' میں فرماتے ہیں کہ جب قرآن حکیم نے حضرت سلمان اور حضرت داؤد کو بادشاہ کے لقب سے نوازا ہے تو ہم ملوکیت کو حرام نہیں قرار دے سکتے، لیکن اس کے برعکس علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم
کہ در دینش ملوکیت حرام است

''میں اس جہاں پناہ کے فقر کا غلام ہوں کہ جس کے دین میں ملوکیت حرام ہے''

علامہ اقبال ملوکیت کے حرام ہونے کی دلیل نبی کریم ﷺ کی زندگی سے لاتے ہیں، جنہوں نے نہ خود بادشاہت کا طریق اپنایا اور نہ ہی اپنے بعد ملوکیت کی کوئی گنجائش چھوڑی۔ اور یہ قرآن کے تصور توحید (لاسلاطین' لاکلیسا' لاالہ) کا اعجاز تھا کہ آپ ﷺ کے وصال کے بعد خلافت کی شکل میں شورائیت کا جمہوری اصول اپنایا گیا ہے جسے علامہ اقبال ''روحانی جمہوریت'' کا نام دیتے ہیں۔ اور تشکیل و تاسیس حریت' مساوات اور اخوتِ بنی نوع آدم کو مقصودِ رسالت

محمد یہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام قرار دیتے ہیں۔اسی طرح ''خطبات بہاولپور'' میں ہی ڈاکٹر محمد حمید اللہ فرماتے ہیں کہ عہد نبوی ﷺ سے لے کر آج تک قانون سازی ایک پرائیویٹ چیز رہی ہے اور کبھی حکومت کی اجارہ داری نہیں رہی جبکہ اس کے برعکس علامہ اقبال پارلیمنٹ کو اجتہاد اور قانون سازی کا حق دیتے ہیں اور اسے اسلامی حدود کا پابند رکھنے کی تدبیر بھی بتلاتے ہیں۔وہ الیکشن اور ووٹ کو بیعت کی جدید شکل قرار دیتے ہیں۔علامہ اقبال کا موقف ہے کہ اسلام پر ملوکیت کی ہزار سالہ گرفت نے مسلمانوں میں ان اداروں کو قائم نہیں ہونے دیا اور دور حاضر کے پیچیدہ معاشرتی' معاشی اور سیاسی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بیک وقت قدیم اور جدید علوم میں جس قسم کی بصیرت درکار ہے' وہ کسی ایک فرد کے بس کی بات نہیں' لہٰذا ان مسائل کو حل کرنے کے لئے اجتماعی کوشش درکار ہے جس کے لئے پارلیمنٹ کا ادارہ اجتہاد و اجتماع کے لئے فورم کا کام دے سکتا ہے۔صرف یہی دو مثالیں یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں کہ ڈاکٹر حمید اللہ قرآن کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے اسلام کو ایک ''قدیم ایشیائی مذہب'' کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور ہزار سالہ پرانی روایت ملوکیت سے رہنمائی حاصل کر رہے ہیں، جبکہ اس کے برعکس علامہ اقبال روحِ عصر کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے قرآن اور اسلام کی ''جدیدیت'' کو بروئے کار لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

لیلۃ القدر میں قیام پاکستان کی معنویت

لیلۃ القدر میں پاکستان کا وجود پذیر ہونا گہری معنویت کا حامل ہے۔سورۃ الدخان کی آیت 3 اور 4 میں لیلۃ القدر کی دو خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

(i) یہ وہ رات ہے جس میں قرآن حکیم نازل ہوا۔(آیت 3)

(ii) یہ وہ رات ہے جس میں ہر معاملے کا حکیمانہ فیصلہ کیا جاتا ہے۔(آیت 4)

چنانچہ لیلۃ القدر میں پاکستان کے قیام کی صورت میں اللہ تعالیٰ کا حکیمانہ فیصلہ ہمارے لئے اس یاددہانی کے ساتھ عمل میں آیا کہ پاکستان کی بقا، ترقی اور سرفرازی کا سرچشمہ حکمت قرآن ہے۔یہی وہ حکمت قرآن ہے جسے علامہ اقبال نے ''قرآن کی گمشدہ حکمت'' قرار دیا ہے اور اس کی بازیافت کو ''قرآن کی جدیدیت'' سے موسوم کیا ہے۔

ماہ رمضان قرآن حکیم کے ''ریفریشر کورس'' کا مہینہ ہے جس میں تراویح کی صورت

میں قرآن حکیم کا دورہ مکمل کیا جاتا ہے اور ہر سال ماہ رمضان میں لیلۃ القدر کا آنا اس بات کی دلیل ہے کہ کُلَّ یَوۡمٍ ھُوَ فِیۡ شَاۡنٍ والی ذات کی طرف سے قرآن کو نئی شان کے ساتھ نازل کیا جاتا ہے۔ شاید اسی لئے احادیث کے مطابق جبرائیل علیہ السلام حضور نبی کریم ﷺ کو ہر سال ماہ رمضان میں قرآن حکیم کا دورہ مکمل کروایا کرتے تھے۔ قرآن حکیم کی اسی نئی شان جدیدیت کے بارے میں سورۃ الانبیاء کی آیت 10 میں بھی بڑے واضح الفاظ میں اعلان کیا گیا ہے

''لوگو! ہم نے تمہارے طرف ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا ہی ذکر ہے
تم یہ بات سمجھتے کیوں نہیں ہو؟''

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اگر اس آیت کے مخاطب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے تو آج فِیۡہِ ذِکۡرُ کُمۡ کے مخاطب براہ راست ہم لوگ ہیں اور فِیۡہِ ذِکۡرُ کُمۡ کا مطلب اس کے سوا اور کیا لیا جا سکتا ہے کہ قرآن آج بھی ہمارے جملہ انفرادی اور اجتماعی مسائل کے سلسلے میں ہدایت کے لئے کفایت کرتا ہے، بشرطیکہ ہم اسے اس انداز میں سمجھنے کی کوشش کریں کہ گویا قرآن موجودہ حالات میں ہمارے لئے آج ہی نازل ہوا۔ اسی طریقے سے ہم قرآن کی جدیدیت تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

قرآن حکیم کی ''جدیدیت'' کے سلسلے میں ہماری نارسائیوں کی شکایت کرتے ہوئے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے خطبہ صدارت میں علامہ اقبال نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا تھا کہ روحانی اعتبار سے تو ہم تخیلات اور احساسات کے ایک ایسے قید خانے میں بند ہو کر رہ گئے ہیں جہاں علماء اور فقہاء کے قدیم فرسودہ خیالات کی زنجیروں نے ہمیں بری طرح جکڑ رکھا ہے اور تلقین کی تھی کہ اب ہمیں ان زنجیروں کو توڑ ڈالنا چاہئے جو ہم نے گزشتہ کئی صدیوں سے اپنے گرد لپیٹ رکھی ہیں اور گہرے تاسف کے ساتھ فرمایا! ''ہم پرانی نسل کے لوگوں کو شرم آنی چاہئے کہ ہم نے اپنی نئی نسلوں کو ان سیاسی، معاشی اور مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہیں کیا جو انہیں مستقبل میں پیش آنے والے ہیں''۔

علامہ اقبال ایسے دانائے راز خال خال ہی پیدا ہوتے ہیں جن پر قدرت قرآن کی جدیدیت کے راز بذریعہ الہام منکشف کرتی ہے۔مگر قدرت کی فیاضی دیکھئے کہ علامہ اقبال کے بعد ڈاکٹر محمد رفیع الدین صحیح معنوں میں ان کے جانشین ثابت ہوئے۔ جن کی کتابیں "IDEOLOGY OF THE FUTURE" اور ''قرآن اور علم جدید'' علامہ اقبال کے اسی مکتب فکری کی مؤثر اور بھرپور نمائندگی اور ترجمانی کرتی ہیں جو قرآن کی جدیدیت کا علمبردار ہے اور یہ بات ان کی کتابوں کے عنوانات سے ہی عیاں ہے،لیکن ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کے بعد فکر اقبال کا کوئی ایسا وارث ابھی تک پیدا نہیں ہوا جو انہی کی طرح قرآن کی جدیدیت کے اسرار و رموز بیان کرے۔

قحط الرجال اور جدیدیتِ قرآن کی تلاش

سوال یہ ہے کہ اس قحط الرجال میں کیا کیا جائے؟ ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ قرآن کی جدیدیت تک رسائی حاصل کرنے کا کیا کوئی ایسا طریقہ بھی ہے جو اس قحط الرجال کے زمانے میں ہمارے کام آسکے؟ تاہم اس کمی کی تلافی کے لئے اجتماعی کاوشیں بروئے کار لائی جا سکتی ہیں اور اس طریق کار کو اپنانے کی قرآن حکیم بھی بڑی واضح الفاظ میں تلقین کرتا ہے۔سورۃ النحل (آیت 44) میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے!

> ''پچھلے رسولوں کو بھی ہم نے روشن نشانیاں اور کتابیں دے کر بھیجا اور اب یہ ذکر (اے نبی ﷺ!) تم پر نازل کیا تا کہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو ان کے لئے اتاری گئی ہے اور تا کہ لوگ (خود بھی) اس میں غور و فکر کریں''

اس آیت میں یہ نکتہ انتہائی معنویت کا حامل ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں جب قرآن ان پر نازل ہو رہا تھا اور آپ ﷺ اس کی تعلیم کی توضیح و تشریح بھی کر رہے تھے عین اس وقت بھی قرآن حکیم اپنے ہر مخاطب سے یہ تقاضا کر رہا تھا کہ وہ خود بھی قرآن میں غور و فکر کرے اور اپنی زندگی کے جملہ انفرادی و اجتماعی مسائل کے بارے میں اس سے ہدایت طلب کرے۔ چنانچہ اگر آج ہم بھی تفکر فی القرآن کو فقط علماء و فقہاء کا تخصص اور فریضہ نہ سمجھیں بلکہ قوم کی اجتماعی کاوشوں کو بروئے کار لائیں تو اس سے قرآن کی جدیدیت تک رسائی حاصل کرنے میں یقیناً بڑی

مدد مل سکتی ہے۔ نیز اس آیت کی رو سے یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن حکیم میں غور وفکر ہر مسلمان کا فریضہ ہے خواہ اس کا علمی اور عقلی مرتبہ کتنا ہی فروتر کیوں نہ ہو اور وہ صرف تراجم کی مدد سے ہی قرآن کو سمجھتا ہو۔ بلا شبہ اگر ناظرہ قرآن پڑھنے والا محض تلاوتِ قرآن پر ثواب کا مستحق ہے تو تراجم کی مدد سے قرآن پر غور وخوض کرنے والا بھی اجر کا امیدوار ہوسکتا ہے۔

علامہ اقبال نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے خطبہ صدارت میں قرآن کی جدیدیت کو بروئے کار لانے کے لئے اجتماعی کاوش کے سلسلے میں دو تجاویز دی تھیں۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ اس زمانے میں ہمارے قدیم مکاتب فقہ کا سرمایہ فکر ناکافی ہو گیا ہے اور نئی اسلامی فقہ کی ضرورت ہے، تاکہ عصر حاضر کے نئے تقاضوں کو ادا کرنے کے لئے قانون سازی کی جاسکے۔ لیکن تنہا علماء اس کام کے اہل نہیں، کیونکہ وہ جدید علم قانون اور دور حاضر کے نئے سماجی اور معاشی مسائل کے بارے میں زیادہ واقفیت نہیں رکھتے۔ اور جو مسلم وکلاء جدید علم قانون میں مہارت رکھتے ہیں وہ علوم دین سے زیادہ واقف نہیں کرتے چنانچہ علامہ اقبال کا خیال تھا کہ علماء اور وکلاء پر مشتمل ایک تحقیقی ادارہ قائم کر دیا جائے تو دونوں کے باہمی تعامل اور امشترکہ کوششوں سے اسلامی قانون کی از سرنو تشریح خ توسیع اور حفاظت کرنے سے ایسی نئی سلامی فقہ معرض وجود میں لائی جا سکتی ہے جو زمانہ حال کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اسی طرح سے آپ نے پارلیمنٹ کو بھی اجتہاد کا حق دیا اور اس کے ساتھ ہی یہ لازم قرار دیا کہ پارلیمنٹ میں ایسے علماء کی ایک معقول تعداد ہونی چاہئے جو قانون سازی کو اسلامی حدود کا پابند رکھنے کے لئے ایوان کی رہنمائی کر سکے۔

دوسری تجویز ملک کے تمام بڑے بڑے شہروں میں مردوں اور عورتوں کے لئے ثقافتی ادارے قائم کرنے کے بارے میں تھی جن کا مقصد یہ بیان کیا گیا تھا کہ نوجوان نسل کو یہ بتایا جاسکے کہ انسان کی مذہبی وثقافتی تاریخ میں اسلام نے اب تک کیا کچھ حاصل کیا ہے اور ابھی کیا کچھ حاصل کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بھی قرآن اور اسلام کی جدیدیت کی تلاش سے ہی منسلک تھا اور ان اداروں کا مقصد قرآن اور اسلام کی جدیدیت کو فروغ دینا تھا، اس لئے علامہ اقبال قرآن کی جدیدیت کو بروئے کار لانے کے لئے ایسے ادارے قائم کرنے کی ضرورت کا احساس دلا رہے تھے اور ان اداروں میں علماء اور غیر علماء دونوں کا اشتراک ضروری خیال کرتے تھے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹینکا میں ''اسلام اور سائنس'' کے عنوان سے جیروم آر راویٹز (JEROME R-RAVETZ) کا جو مقالہ شامل ہے اس میں اس نے اسلامی دنیا میں سائنس کے زوال پذیر ہونے کی بنیادی وجہ یہ بتائی ہے کہ مسلمان ممالک میں کہیں بھی سائنس کا اداراتی ڈھانچہ قائم نہیں کیا گیا۔ وہ لکھتا ہے کہ نویں صدی عیسوی میں مسلم سائنس دان علم ریاضی، علم ہیئت، علم بصریات، علم کیمیا اور علم طب میں شاندار پیش رفتیں کر رہے تھے، لیکن ان کی یہ ترقی دیر تک قائم نہ رہ سکی جس کا واحد سبب وہ یہ بیان کرتا ہے کہ!

> ''مسلمان سائنس دان اگرچہ اپنی اپنی جگہ بڑے بڑے تخلیقی کارہائے نمایاں انجام دے رہے تھے، لیکن ان کی معاشرتی بنیاد (SOCIAL BASE) بہت کمزور تھی، جس کی وجہ سے ان میں وہ علمی تعاون مفقود تھا جو نچلے درجے کے سائنس دانوں کو بھی مؤثر بنا دیتا ہے''۔

یہی صورت حال دینی علوم کی ترقی کے بارے میں ہمیں آج بھی درپیش ہے۔ چنانچہ اس جمود سے نکلنے کی بھی واحد تدبیر یہی ہے کہ دینی علوم کی تحقیق میں معاشرتی بنیاد کو وسعت دی جائے۔ تاکہ دینی علوم کو جدیدیت آشنا کیا جا سکے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ قرآن حکیم کی تشریح و تفسیر پر کسی ایک عالم دین یا کسی ایک مکتب فکر کی اجارہ داری تسلیم نہ کی جائے اور قرآن حکیم میں غور و فکر کا حق ہر شخص کو دیا جائے جیسا کہ خود قرآن کا منشا ہے لیکن ہر فرد کے حاصلاتِ تفکر فی القرآن کو ثقافتی اداروں (CULTURAL INSTITUTES) میں ایسے روشن خیال علماء کی نگرانی میں زیر بحث لایا جائے جنہیں عربی زبان اور قرآن و حدیث پر پورا پورا عبور حاصل ہو اور وہ یہ فیصلہ دینے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں کہ ان کا تفکر فی القرآن نبی کریم ﷺ کی تشریح و توضیح کے منافی تو نہیں اور وہ اپنے خیالات میں گمراہی کے راستے پر تو نہیں چل نکلے۔

تحریک تفکر فی القرآن

یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ گزشتہ پچیس سال کے عرصے میں حافظ نذر محمدؒ ڈاکٹر اسرار احمد، جاوید احمد غامدی، سید شبیر احمد اور ان جیسے کئی اور علماء نے نوجوان نسل میں رجوع الی القرآن کا ذوق و شوق پیدا کرنے میں شاندار خدمات انجام دی ہیں اور حلقہ ہائے درس قرآن قائم کر کے

لوگوں کے دلوں میں نورِ قرآن کی شمعیں فروزاں کی ہیں۔ یہ حضرات زیادہ تر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے مکاتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ رجوع الی القرآن کی تحریک کے ساتھ ساتھ تفکر فی القرآن کی تحریک کا آغاز کیا جائے اور اس غرض کے لئے پاکستان کے تمام شہروں میں جہاں جہاں بھی ممکن ہو ایسے کلچر انسٹیٹیوٹ قائم کئے جائیں جہاں تمام مکاتب فکر کے لوگ جمع ہوسکیں اور حالات حاضرہ اور مسائل اُمہ کو زیر بحث لا کر قرآن سے رہنمائی اور ہدایت حاصل کرسکیں۔

اس میں شک نہیں کہ پاکستان کے موجودہ حالات انتہائی مایوس کن ہیں، لیکن ہمیں اس بات کو ہرگز نہیں بھولنا چاہئے کہ پاکستان کا قیام لیلۃ القدر کی مبارک ساعتوں میں اللہ تعالیٰ کے حکیمانہ فیصلہ کے تحت عمل میں آیا۔ لہٰذا ہمیں یقین رکھنا چاہئے کہ پاکستان کا مستقبل بہت روشن ہے۔ البتہ اس سلسلے میں جو ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے ہمیں اسے پورا کرنے کی فکر کرنی چاہئے یعنی قرآن کی جدیدیت تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اجتماعی کاوشوں کو بروئے کار لائیں تاکہ علامہ اقبال کی خواہش کے مطابق پاکستان میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار کی جاسکے۔

ہمارے علماء نے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں پر مغرب زدگی اور سیکولرزم کی مہر لگا کر انہیں دینی اعتبار سے ناقابل اعتماد قرار دے رکھا ہے حالانکہ ان میں سے کتنے ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اپنے محدود دینی علم کے باوجود اسلام کے معاشی اور سیاسی مسائل پر جدید علوم کی روشنی میں قابل قدر تحقیقی کام کیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں دُور کرنے کی بجائے قریب لایا جائے۔ علوم تازہ کی سرمستی گناہ نہیں بلکہ کبھی کبھی یہ بھی قرآنی حقائق تک پہنچا دیتی ہے۔

؎ کھلے ہیں سب کے لئے غریبوں کے میخانے
علوم تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں
گہے رسم و رہ فرزانگی ذوق جنون بخشد
من از درس خردمنداں گریباں چاک می آئم

''کبھی کبھی عقل بھی انسان کو ذوق جنون بخش دیتی ہے۔ مجھے دیکھئے میں عقل

مندوں کے درس سے اپنا گریبان چاک کر کے آیا ہوں''۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر رفیع الدین کا موقف تو یہ تھا!

''ہم نے علم کو علمِ دین تک اور دین کو قرآن اور حدیث کے الفاظ تک محدود کر دیا۔ حالانکہ اس وقت جس قدر صحیح اور سچا علم دنیا میں موجود ہے یا آئندہ زمانوں میں انسان کی ذہنی کاوش سے پیدا ہونے والا ہے وہ علم دین کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس زمانہ میں علوم کی ترقی قرآن کو بہت آگے لے گئی ہے لیکن ہم وہیں کے وہیں ہیں، بلکہ قرآن آگے جا رہا ہے اور ہمارا رُخ پیچھے کی طرف ہے''۔

اور اپنے اس موقف کے بارے میں انہیں اتنا یقین اور اس حد تک اعتماد تھا کہ انہوں نے علم جدید کا قرآن حکیم کے ساتھ رشتہ استوار کرنے کو نبوت سے ''معنوی قرب'' قرار دیا، وہ لکھتے ہیں!

''ہم میں سے بعض کا خیال ہے کہ اسلام کی والہانہ محبت کا جو مقام مسلمانوں کو اسلام کے ابتدائی دور میں حاصل تھا وہ پھر کبھی عود نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے! (خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ) لیکن ہم اس حدیث کی ایسی تشریح نہیں کر سکتے جو قرآن اور حدیث کے باقی ارشادات سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ نبوت کا قرب ایسا ہے جیسے چراغ کی روشنی کہ جوں جوں ہم اس سے دور ہوتے جائیں، کم ہوتی جاتی ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جہاں تک ایمان اور اعتقاد کا تعلق ہے خیر القرون جیسا زمانہ کبھی عود نہیں کر سکتا حضور ﷺ کے زمانہ میں مسلمانوں کو جو اسلام کی شدید محبت حاصل تھی اگرچہ نبوت کی ہدایت کے بغیر اس کا حصول ہرگز ممکن نہیں، لیکن وہ کوئی ایسا کمال نہیں تھا جو انسان کو نبوت کے زمانی قرب سے ہی حاصل ہو سکتا ہو اور جس کیلئے انسان کی فطرت کے اندر مستقل طور پر کوئی سامان نہ رکھا گیا ہو نبوت کے زمانی قرب نے ہمیں ایمان کی جس دولت سے مالا مال کیا تھا اب نشاۃ ثانیہ میں نبوت کا معنوی قرب جو فلسفہ اور سائنس کے ذریعہ سے حاصل ہوگا پھر ہمیں اس سے مالا مال کرے گا

اور یہ ایسا قرب ہوگا جسے زوال نہیں اور جو مرورِ زمانہ سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہوتا رہے گا''۔

چنانچہ فرماتے ہیں!

''ہوسکتا ہے کہ اسلام کا یہ آخری دور ابتدائی دور سے بھی بہتر ثابت ہو۔ حضور ﷺ نے اس بات کا ذکر کرتے ہوئے بڑے حوصلہ افزا الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے!''خوش ہو جاؤ، خوش ہو جاؤ، بے شک میری امت کی مثال بارش کی طرح ہے کہ نہیں کہا سکتا کہ اس کی ابتدا بہتر ہے یا انتہا۔''(المشکاۃ)

ڈاکٹر رفیع الدین اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ انسان کا ذہن کوئی ایسی علمی حقیقت دریافت نہیں کرسکتا جو فی الواقع ایک سچی حقیقت تو ہو لیکن قرآن کی تشریح وتفسیر نہ ہو۔ان کا موقف بڑا دوٹوک ہے!

''سائنس اور فلسفہ کی ہر ترقی خواہ وہ دنیا کے کسی مقام پر اور کسی شخص کی وجہ سے ظہور میں آئے قرآن کے درخت میں ایک نیا پتہ، نئی شاخ یا ایک نیا پھول یا پھل ہے۔ چونکہ علم کی ترقی جاری رہے گی اور علم وحی نبوت کی رہنمائی میں آخر کار اغلاط سے پاک ہوتا رہے گا، ظاہر ہے کہ قرآن کی شاخیں، پھل، پھول اور پتے قیامت تک نکل نکل کر نوع انسانی کو بہار حسن دکھاتے رہیں گے اور اس کی ہر قسم کی ترقیوں کو ممکن بناتے رہیں گے اور ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب قرآن کے علم کا درخت پھیل کر تمام کائنات کا احاطہ کرے گا اور دنیا کا سارا علم اپنی ساری وسعتوں کے باوجود فقط قرآن کا علم ہوگا''۔

مختصر یہ کہ ڈاکٹر رفیع الدین اس بات میں پختہ یقین رکھتے تھے کہ قرآن حکیم جدید علوم یعنی فلسفہ وسائنس کے تمام حقائق کو علم وحی کی روشنی میں اغلاط سے پاک کرکے اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔اسی چیز کو علامہ اقبال نے جدیدیت قرآن سے تعبیر کیا ہے اور اسے دور حاضر میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی، جو پاکستان کی غرض وغایت ہے، لازمی شرط ٹھہرایا ہے۔

چنانچہ ہمارا یہ خیال ہے کہ جدیدیت قرآن تک رسائی حاصل کرنے کے لئے پاکستان

میں تفکر فی القرآن کی جان دار اور زوردار تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔ قرآن ہمیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پکار رہا ہے کہ کیا تمہارے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں کہ تم قرآن میں تدبر نہیں کرتے؟ لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ عام مسلمان اس پکار کا مخاطب صرف اور صرف علماء کرام کو سمجھتا ہے اور ہمارے علماء بھی قرآن حکیم میں عام مسلمانوں کو فرداً فرداً غور کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے، کیونکہ وہ انہیں اس کا اہل ہی نہیں سمجھتے۔

آخری بات

قرآن کی جدیدیت کے ذریعے علامہ اقبال نے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا جو خواب دیکھا تھا اس کا ذکر انہوں نے مکاشفاتی انداز میں پیامِ مشرق کی نظم ''نقشِ فرنگ'' میں بھی کیا ہے جس میں وہ پوری تحدی سے دعویٰ کرتے ہیں کہ مغربی سرمایہ دارانہ استعمار کا قائم کردہ ظالمانہ عالمی نظام یقینی طور پر ختم ہو کر رہے گا اور اس کی جگہ اسلام کا منصفانہ عالمی نظام لے گا۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

؎ چشم بکشائے اگر چشم تو صاحب نظر است
زندگی در پے تعمیر جہانِ دگر است

''آنکھ کھول اور دیکھ اگر تیری آنکھ نورِ بصیرت رکھتی ہے کہ زندگی ایک نیا جہاں تعمیر کرنے کے درپے ہے''۔

؎ من دریں خاکِ کہن گوہر جاں می بینم
چشم ہر ذرہ چو انجم نگراں می بینم

''میں دنیا کی خاکِ کہن میں گوہر زندگی دیکھ رہا ہوں اور مجھے خاک کا ہر ذرہ اس انتظار میں آنکھیں کھولے نظر آتا ہے''۔

؎ دانہ را کہ بآغوشِ زمیں است ہنوز
شاخ در شاخ برومند و جواں می بینم

''وہ دانہ جو ابھی زیر زمین پوشیدہ ہے، میں اسے جوان ہوتے اور شاخ در شاخ پھلتا پھولتا دیکھ رہا ہوں''۔

؎ کوہ را مثل پرِ کاہ سبک می یابم
پرِ کاہے صفتِ کوہِ گراں می بینم

''مجھے (مغربی تہذیب کا) پہاڑ تنکے کی مانند ہلکا نظر آتا ہے اور پرکاہ (اسلام اپنی موجودہ کمزور حالت میں بھی) مجھے کوہِ گراں نظر آتا ہے''۔

؎ انقلابے کہ نگنجد بہ ضمیرِ افلاک
بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم

''وہ انقلاب جو آسمانوں کے ضمیر میں نہیں سما رہا، وہ مجھے صاف نظر آ رہا ہے اور نہیں جانتا کہ کیسے نظر آ رہا ہے''۔

''بینمو ہیچ ندانم کہ چساں می بینم'' کے الفاظ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ ان اشعار میں اسی دوسرے مکاشفہ کا بیان ہے جس کا ذکر علامہ اقبال نے چوہدری محمد حسین کے نام اپنے خط (مورخہ 30۔اگست 1923ء) میں کیا۔'' پیام مشرق'' کی اشاعت بھی اس خط سے تین ماہ قبل (مئی 1923ء) ہوئی تھی اور نظم ''نقشِ فرنگ'' میں ہی آپ نے یہ پیام دیا ہے کہ ع ''وقت آن است کہ آئین دگر تازہ کنیم'' (وقت آ گیا ہے کہ ہم نیا آئین بروئے کار لائیں) یہ ''آئین دگر'' قرآن ہی کا آئین ہے جو بقول اقبال قرآن کی جدیدیت پر استوار ہوگا۔

قرآن حکیم چودہ سو سال قبل نازل ہوا۔ اس کے ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف بلکہ زیروزبر تک کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے اور اس بنا پر قرآن ہمیشہ کیلئے ناقابل تحریف ہے۔ تاہم اس کے الفاظ کی وسعت معانی لامحدود ہے، یعنی بقول اقبال ع صد جہاں پوشیدہ در قرآں ہنوز''۔ لیلۃ القدر ہر سال ہمارے لئے قرآن کی معنوی تازگی کا یہی پیغام لاتی ہے جسے علامہ اقبال قرآن کی ''جدیدیت'' سے موسوم کرتے ہیں اور اسے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ناگزیر قرار دیتے ہیں۔

شب نزول قرآن میں پاکستان کا قیام قدرت کی طرف سے ہمارے لئے ایک اشارہ ہے کہ تفکر فی القرآن کے ذریعے قرآن کی جدیدیت کا سراغ لگا کر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز

کریں اور دنیا کو اسلامی عدل و احسان کے اس نئے عالمی نظام سے روشناس کرائیں جس کا آج سیاسی اور معاشی استحصال کی ماری مجبور و مقہور انسانیت کو شدت سے انتظار ہے۔

(بشکریہ ماہنامہ میثاق لاہور ستمبر 2008ء)

تصوف

تصوف کیا ہے؟ اور کیا نہیں ہے؟ اس کے بارے میں ہمارے ہاں مسلمانوں میں دو متضاد نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں اور دونوں اپنی رائے کے حق میں بڑے محکم اور مستند دلائل دیتے ہیں۔

ایک طبقہ تصوف کی حمایت میں ہے اور سارے سلاسل اور ان کی تعلیمات کو عین اسلام اور قرآن وحدیث کے مطابق یا کم از کم اس سے ماخوذ سمجھتا ہے اس طبقہ کے نزدیک یہ سلسلہ رُشد و ہدایت خود صحابہ کرام ﷺ تک بلکہ ان کے واسطے سے خود پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ تک پہنچتا ہے مگر

عجیب بات ہے کہ سلسلہ نقشبندیہ کے بزرگ اسے حضرت ابوبکر ؓ سے جوڑتے ہیں۔ جبکہ باقی سارے سلاسل اسے حضرت علی ؓ سے جوڑتے ہیں جبکہ تصوف کا کوئی سلسلہ حضرت عمر ؓ اور حضرت عثمان ؓ کی طرف منسوب نہیں۔ ہمارے ہاں ایک طبقے کو حضرت عمر ؓ اور حضرت عثمان ؓ سے مخاصمت ہے لہٰذا اس سے صحابہ کرام ؓ کے درمیان مستقل تفریق پیدا ہو جاتی ہے کہ خلفائے راشدین میں سے دو جلیل القدر ہستیاں تصوف کے اس ''چشمہ صافی'' کی برکات و فیوضات سے تہی دامن ہیں۔

دوسرا طبقہ تصوف کے نام سے (ALLERGIC) ہے اور لفظ تصوف کے اشتقاق اور ''صوفی'' کے معانی کے تعین کے بارے میں مدلل گفتگو سے اس لفظ تصوف کو غیر اسلامی ثابت کرتا ہے۔ لہٰذا ——— اس اصطلاح کے استعمال سے لازماً اس اصطلاح کے غیر اسلامی رنگ کا کوئی نہ کوئی حصہ ہمارے ذہنوں پر بھی گہرے نقوش چھوڑ جاتا ہے ایسے حضرات کے نزدیک تصوف نے اسلام کو بہت نقصان پہنچایا ہے اور ساری بے عملی اور بدعملی اس تصوف کے رجحانات کی وجہ سے ہے نیز صحابہ ؓ میں اس طرح کی کوئی محافل اور مراقبات کا سراغ نہیں ملتا۔

چنانچہ ——— حضرت عمر ؓ اور ''تصوف'' کا مضمون شائع ہونے پر حسب توقع دونوں طرف سے بہت سارے فون آئے جس میں اپنے اپنے نقطہ نظر کے حوالے سے مضمون پر تنقید تھی۔ حضرت عمر ؓ اور ''تصوف'' کا عنوان ہی چونکا دینے والا ہے۔ ہمارے نزدیک ہمارے دو متضاد نقطہ ہائے نظر کی وجہ سے جو نتیجہ نکلتا ہے۔ وہ یہ کہ تصوف جس ''شئے'' کا نام ہے وہ کوئی حقیقت ضرور ہے۔ جس کے لئے قرآن و حدیث کے ''مدعا'' کے حصول کے لئے اس اصطلاح کو رواج دیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک تصوف کے ''اعلیٰ'' مقاصد اور ہیں اور یہ مقاصد جلیلہ اسلام کے عین مطابق بلکہ اس کی عین تعلیمات ہیں اور ان مقاصد کے حصول کی ضرورت کا احساس ہر آسمانی مذہب میں پایا جانا ضروری ہے اور پایا بھی جاتا ہے۔ اس عنوان کا دوسرا حصہ تصوف میں ان اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے اس کے حامیان اور عاشقان الٰہی نے جو طریقہ ہائے کار مقرر کئے ہیں وہ ——— ایک شئے دیگر ہے۔ دونوں کو خلط ملط کرنے ہی سے سارے اختلافی مسائل اور ساری غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تصوف کے اعلیٰ مقاصد چونکہ انسان کی داخلی کیفیات اور ''من کے اندر'' کی چیزیں ہیں جو نگاہوں کے سامنے

نہیں آ سکتیں لہٰذا بجا طور پر اس راستے ''باطنیت'' اور اسلامی تصوف کی آڑ میں بعض بد باطن اور ''بدطینت'' لوگوں نے اسلامی تصوف کا لبادہ اوڑھ کر اسلام ہی کے عقائد اور اس کی تعلیمات کے چشمہ ءِصافی کو گدلا بلکہ زہر آلودہ کرنے کا کام کیا ہے۔ جس سے ایک طرف اسلام کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا اور عوام میں بے عملی اور بے حسی کی کیفیت اور رُجحان پرورش پانے لگا۔ جبکہ دوسری طرف ''صوفیاء'' کا طبقہ بھی بدنام ہو گیا اور عوام اور خواص کی نگاہ میں ان کی قدر و منزلت ختم ہوتی چلی گئی بلکہ بعض صورتوں میں مخالفت و مخاصمت نے جگہ لے لی اور مسلمانوں میں عقل و نقل کی کشمکش، عقل و عشق کے جھگڑے اور صوفی و ملّا کی مخاصمت جیسے عنوانات کے تحت بحث و تمحیص کا م شروع ہو گیا۔

ہمارے نزدیک دیانتداری کا تقاضا یہ ہے کہ اس سارے پس منظر میں تصوف کے اصولی مقاصد کو الگ سمجھنے کی کوشش کی جائے اور ان مقاصد کے حصول کے لئے جو حضرات صوفیاء نے طریقے اختیار فرمائے ہیں ان کو الگ موضوع بحث بنایا جائے۔

ذیل میں ہم حقیقت تصوف نامی کتابچے سے ایک حصہ ہدیہ قارئین کر رہے ہیں تا کہ پہلے مرحلے میں تصوف کے اعلیٰ مقاصد کا ادراک ہو اور اس کے لئے قرآن و حدیث کی اصطلاح ''احسان'' سے بھی تعارف ہو سکے۔ جس سے اہل تصوف کو اپنی منزل سے تنبُّہ ہو گا اور استحضار کی کیفیت پیدا ہو گی جبکہ ناقدین تصوف کے لئے گنجائش ہو گی کہ وہ ان مقاصد کے حصول کے لئے (جو عین قرآن و سنت کے مطابق ہیں) اپنے طور پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقوں سے اپنے لئے لائحہ عمل مرتب کر سکیں۔ اصل مطمع نظر اور نصب العین تو ان مقاصد جلیلہ کو پالینا ہے اور مطلوبہ کیفیات کو اپنے اندر جاگزیں کر لینا ہے۔ (ادارہ)

حقیقت تصوف

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

مسائل حکمت کے ضمن میں ہمارے آج کے موضوع کا جامع عنوان ''تصوف'' ہے اور اس ضمن میں خاص طور پر یہ کہ اس کا سنت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ سے انحراف کس نوعیت کا تھا اور کیوں

ہوا؟ چونکہ یہ موضوع بہت طویل ہے اس لیے میں تمہید میں کوئی وقت ضائع کئے بغیر براہ راست گفتگو کا آغاز کر رہا ہوں اور کوشش کروں گا کہ تکرار اور اعادے کی ضرورت کم سے کم پیش آئے۔

تصوف کا موضوع اور اس کے مقاصد

پہلی بات یہ ہے کہ تصوف کا موضوع اور مقصد کیا ہے؟ اس کے ضمن میں پہلا مشاہدہ (OBSERVATION) یہ ہے کہ تصوف کا موضوع اور مقاصد صد فی صد درست اور خالص اسلامی ہیں۔ اگر ہم انہیں معین الفاظ کا جامع پہنائیں تو وہ یہ ہیں:

اولاً' جہل سے نجات اور معرفت کا حصول۔

ثانیاً' تہذیب و تزکیۂ نفس (تہذیب = مہذب بنانا۔ ہم نے دسویں جماعت میں ایک عربی شعر پڑھا تھا جس میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں: ''رَبُّوْا بَنِیْکُمْ' عَلِّمُوْھُمْ' ھَذِّبُوْا فَتَیَاتِکُمْ'' اولاد کے لیے تعلیم کے ساتھ ہی تہذیب کا لفظ آتا ہے۔)

ثالثاً' تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح (یعنی روح کو جلا دینا اور اسے انوارِ الٰہی سے منور کرنا) اس ضمن میں میرے استاد مرحوم مولانا منتخب الحق قادری رحمہ اللہ نے ابن سینا کا ایک جملہ سنایا تھا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تجلیات ربانی سے تمہیں کوئی حصہ ملے تو ''فَجَاھِدْ فِیْ خَلَوَاتِكَ ''اپنی خلوتوں میں مجاہدے کرو' مراقبے کرو ''فَلَعَلَّ شَعْشَعَةً تَلْمَعُ لَكَ '' تو شاید کبھی تجلیٔ خداوندی کی کوئی شعاع تمہارے لئے بھی چمک اٹھے۔

رابعاً' خالق سے خلوص و اخلاص (اور دنیا و مافیہا سے بے رغبتی) ..... اور خامساً' مخلوق کی خدمت۔ شیخ سعدیؒ کا بہت پیارا شعر ہے ؎

طریقت بجز خدمت خلق نیست
بتسبیح و سجادہ و دلق نیست

یعنی طریقت تو صرف خدمت خلق کا نام ہے' سوائے خدمت خلق کے طریقت کی کوئی حقیقت نہیں۔ ہاتھ میں تسبیح ہو' جائے نماز کندھے پر ہو اور دلق یعنی گدڑی اوڑھی ہوئی ہو یہ تصوف اور طریقت نہیں ہے' بلکہ طریقت تو نام ہے خدمت خلق کا۔ اب ظاہر ہے کہ یہ تمام مقاصد دین ہی کے مقاصد ہیں' جو مطلوب ہیں۔ لہٰذا جہاں تک تصوف کے مقاصد اور تصوف کے موضوع کا تعلق

ہے وہ عین دین ہے اور وہ عین مطلوب ہے۔

''تصوف'' کی اصطلاح اور اس کا ماخذ

لیکن اس کے ضمن میں پہلی ہمالیہ جیسی غلطی اس کے لئے خالص ''غیر قرآنی'' ہی نہیں بلکہ ایک ''مجہول الاصل'' عنوان کا اختیار کر لیا جانا ہے۔ یہ دو الفاظ نوٹ کر لیجیے: ایک تو یہ لفظ غیر قرآنی ہے، لفظ تصوف کا کوئی تعلق نہ قرآن سے ہے نہ سنت اور حدیث سے۔ دوسرے یہ کہ یہ لفظ مجہول الاصل بھی ہے' جس کا مادہ ہی متفق علیہ نہیں۔ اس کے بارے میں پہلی بات یہ نوٹ کر لیجیے کہ یہ لفظ دوسری صدی ہجری کے اختتام کے قریب استعمال ہونا شروع ہوا۔ ڈاکٹر میر ولی الدین نے تو اس کے لیے باقاعدہ سن معین کیا ہے 822 عیسوی۔ حضور ﷺ کا انتقال 632ء میں ہوا' اور ہجرت 622ء میں ہوئی' تو حضور ﷺ کے انتقال کے 190 برس بعد' بلکہ قمری تقوم کے اعتبار سے 196 برس بعد' یہ لفظ ایجاد ہوا ہے۔

دوسری بات یہ نوٹ کیجیے کہ اس کے ماخذ کے بارے میں جو چار آراء رہی ہیں کہ یہ لفظ عربی کے کس مادے سے اخذ کیا گیا ہے' ان میں سے تین تو بالکل غلط ہیں اور ان کا غلط ہونا صد فی صد ثابت ہے۔ چنانچہ ایک رائے یہ ہے کہ یہ لفظ ''صفا'' سے بنا ہے' حالانکہ صرف ونحو کے کسی قاعدے کی رو سے ''صفا'' سے ''صوفی'' کا لفظ نہیں بن سکتا بلکہ اس سے ''صفوی'' بنے گا' جیسے خاندان صفوی۔ دوسری رائے یہ ہے کہ تصوف کا لفظ ''صفّ'' سے بنا ہے' لیکن یہ اس سے بھی ہرگز نہیں بن سکتا۔ ''صف'' کے ساتھ یائے نسبت کا اضافہ کریں تو ''صفی'' بنے گا نہ کہ ''صوفی''۔ تیسری رائے یہ کہ ''صُفّہ'' سے بنا ہے' وہ بھی غلط ہے' کیونکہ صُفہ سے ''صُفّی'' بنتا ہے' صوفی نہیں۔ ڈاکٹر میر ولی الدین ان لوگوں میں سے ہیں جو قدیم اور جدید دونوں کے عالم ہیں۔ ان کی فلسفے میں ڈاکٹریٹ تھی اور اسلامی تصوف پر ان کی متعدد کتابیں ہیں۔ ان کی ایک تصنیف قرآنی تصوف پر ہے' جس میں انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ یہ تینوں باتیں بے بنیاد ہیں۔

البتہ ایک رائے یہ ہے کہ اس کا مصدر یا مادہ لفظ ''صُوف'' ہے اور عام طور پر یہی بات مانی جاتی ہے اور اکثر لوگوں کی رائے یہی ہے کہ یہ ''صُوف'' ہی سے بنا ہے۔ اس ضمن میں اپنی رائے میں بعد میں بیان کروں گا' لیکن یہ بات ایک درجے میں قابل قبول ضرور ہے' گرائمر میں

صوف سے صوفی بن جاتا ہے۔اس اشتقاق کہ وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہ جو اللہ والے حضرات تھے، جن کی زیادہ توجہ دنیا کی بجائے اللہ کی طرف تھی، ان میں دنیا و مافیہا سے بے رغبتی تھی، اللہ کے ساتھ خلوص و اخلاص تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ معرفت کے حامل تھے، جنہوں نے تہذیبِ نفس، تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح کی منزلیں طے کی تھیں، جن میں درویشی تھی، یہ حضرات اون کا لباس پہنا کرتے تھے جس کے نیچے کوئی اور لباس نہیں ہوتا تھا، تا کہ اس کے ذریعے چبھن اور بے آرامی کا احساس ہوتا رہے یعنی آرام کی بجائے سختی کی عادت پڑے چنانچہ یہی لفظ اقبال نے اپنے اس شعر میں استعمال کیا ہے:

؎ صوفیٔ پشمینہ پوش حال مست
از شرابِ نغمۂ قوال مست

تو یہ لوگ اون کا کھردرا لباس پہنتے تا کہ اندر سے بال کاٹتے رہیں اور اس طرح ان کے نفس کو استراحت کے بجائے تکلیف اور کوفت کا احساس ہوتا رہے۔اس رائے پر تقریباً اجماع ہے اور یہ لغت کے اعتبار سے بھی صحیح ہے۔

اس ضمن میں میری ذاتی رائے مختلف ہے اور اپنے علم کی حد تک میں اس رائے میں منفرد ہوں۔ میرے نزدیک لفظ ''تصوف'' کا ماخذ یونانی لفظ ''SOPHIA'' ہے جو بعض علوم کے ساتھ لاحقے کے طور پر آتا ہے۔مثلاً PHILOSOPHY۔یونانی زبان میں SOPHIA کا معنی ہے WISDAM یعنی حکمت و دانائی، اور SOPHOS حکیم و دانا (WISE) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔لفظ تصوف درحقیقت THEOSOPHY سے بنا ہے جو عرفان و معرفت خداوندی کا علم ہے۔ THEO کا لفظ یونانی زبان میں مذہبی معاملات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ اسی سے THEOCRACY کی اصطلاح بنی ہے جو مذہبی لوگوں کی حکومت کے لئے استعمال ہوتی ہے۔اور میں نے بارہا کہا ہے کہ میں اس ضمن میں مولانا مودودی مرحوم کی رائے کو بالکل صحیح سمجھتا ہوں کہ اسلامی ریاست نہ تھیوکریسی ہے اور نہ ڈیموکریسی، بلکہ یہ ایک ''تھیوڈیموکریسی'' ہے، کیونکہ اس میں ''THEO'' اور ''DEMO'' دونوں عنصر جمع ہیں۔ بالکل اسی طرح کا معاملہ THEOSOPHY کا بھی ہے۔چنانچہ یہ لفظ آج بھی استعمال ہوتا ہے، اور

درحقیقت تصوف کا لفظ یہیں سے آیا ہے۔اور یہ بات ہر شخص کے علم میں ہے کہ دوسری صدی ہجری کے دوران یونانی فلسفہ اور نوافلاطونی تصوف کا ایک بہت بڑا سیلاب عالم اسلام پر آچکا ہے۔لفظ تصوف کے اشتقاق کے بارے میں یہ میری ذاتی رائے ہے' کوئی اسے قبول کرنا چاہے تو کرے' نہ کرنا چاہے تو رد کردے۔بہرحال اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ تصوف کی اصطلاح مجہول الاصل ہے۔

پہاڑ جیسی غلطی کے ہولناک نتائج

(i) **کتاب وسنت کی اہم اصطلاح سے محجوبیت۔** اس ہمالیہ جیسی غلطی کے جو ہولناک نتائج نکلے' ان میں سے اولین یہ ہے کہ کتاب وسنت کی اہم اصطلاح ''احسان'' سے محجوبیت اور محرومی ہوگئی اور اب ہمیں لفظ احسان کے صرف ایک ہی معنی معلوم رہ گئے ہیں یعنی کسی سے حسن سلوک کرنا' کسی سے بھلائی کرنا۔اگرچہ اس لفظ کے یہ معنی بھی ہیں' چنانچہ اس معنی میں یہ لفظ قرآن حکیم کی سورۂ قصص میں استعمال ہوا ہے یعنی: ''اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ'' لیکن ''احسان'' دین کی ایک اہم اصطلاح بھی ہے۔چنانچہ اسلام کے بعد ایمان اور ایمان کے بعد احسان کا درجہ ہے۔اس کا عمومی مفہوم ہے کسی بھی شے میں حسن پیدا کردینا۔گویا ایک ہے مارے باندھے کوئی کام کیا' اس کے بنیادی تقاضے اور لوازم پورے کردیئے' لیکن ایک ہے پوری طرح جان کھپا کر' دل لگا کر' پوری توجہ اور اپنی ساری صلاحیتوں اور توانائیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کام کو اچھے سے اچھا' عمدہ سے عمدہ انداز سے کرنا۔چنانچہ ایک حدیث نبوی ﷺ کے الفاظ ہیں: اِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوا الذِّبْحَةَ یعنی کسی کو قتل کرنا ہے تو بھی خوبصورتی کے ساتھ قتل کرو اور کسی جانور کو ذبح کرنا ہے تو اسے بھی خوبصورتی کے ساتھ ذبح کرو کسی کو اذیتیں دے دے کر نہ مارو۔آج کل سعودی عرب میں جو BEHEADING ہوتی ہے یعنی جب سر قلم کیا جاتا ہے تو ایک ہی وار ہوتا ہے۔سوائے رجم کی سزا کے جس کے لئے ایک عبرت ناک ماحول پیدا کرنا مقصود ہے۔اسی طرح ذبح کرنا مقصود ہو تو چھری تیز ہونی چاہیے تاکہ جانور کو تکلیف کم سے کم ہو' بس ایک ہی مرتبہ آپ کی چھری اس مقصد کو پورا کردے۔اسی مفہوم میں یہ لفظ ایک اور حدیث نبویؐ میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ استعمال ہوا ہے یعنی: مِنْ حُسْنِ

اِسُلَامِ الُمَرُءِ تَرُ کُهٗ مَالَایَعُنِیُه یعنی کسی شخص کے اسلام کی خوبی اورخوبصورتی یہ ہے کہ وہ ہراس کام کوترک کردے جس سے نہ کوئی دنیوی ضرورت پوری ہوتی ہو‘نہ اخروی اجروثواب متوقع ہو۔

یہ بہت بڑی محرومی ہے کہ دین کی ایک اتنی بنیادی اصطلاح جوحدیث جبرائیلؑ میں آئی ہےان الفاظ کےحوالے سے کہ فاخبرنی عن الاسلام ‘ اخبرنی عن الایمان‘ اخبرنی عن الاحسان اس سےامت محروم اور محجوب ہوگئی۔قرآن مجید کی جوآیت میں نے ابتداء میں آپ کوسنائی اس میں ایمان کے دومرحلے بیان ہوئے‘ایک قانونی ایمان اور دوسرا حقیقی ایمان۔ یہ مطالعہ قرآن حکیم کے ہمارے منتخب نصاب کی ایک مرکزی بحث ہے کہ قانونی ایمان یعنی اسلام اور حقیقی ایمان میں کیا فرق ہے۔ قانونی ایمان کے درجے میں عمل علیحدہ ہے ایمان سے‘ جب کہ حقیقی ایمان کے درجے میں عمل جزولاینفک بن جاتا ہے ایمان کا۔ پھراس سے اوپر تیسرا درجہ احسان کا ہے۔اس ضمن میں سورۂ مائدہ کی یہ آیت بڑی اہم ہے:

لَیُسَ عَلَی الَّذِیُنَ اٰمَنُوُا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیُمَاطَعِمُوُا اِذَامَا اتَّقَوُا وَّ اٰمَنُوُا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوُا وَّ اٰمَنُوُا ثُمَّ اتَّقَوُا وَّ اَحُسَنُوا وَاللّٰهُ یُحِبُّ الُمُحُسِنِیُنَo (آیت-93)

جولوگ بھی ایمان اورعمل صالح پر مسلسل کاربندرہےان پرکوئی الزام نہیں ان چیزوں کے ضمن میں جووہ پہلے کھاپی چکے۔(یعنی اگرکسی نے کسی شے کی حرمت قطعی کاحکم آنے سے قبل کھایا پیا ہےتواس کا معاملہ یہ نہیں کہ اب وہ حرام شے گویا جسم میں رچ بس گئی ہو)۔درآنحالیکہ ان کی مسلسل روش یہ رہی ہے کہ انہوں نےتقویٰ اختیار کیا پھرایمان لائے‘اورعمل صالح کیا‘ پھراور تقویٰ بڑھا تو وہ مزید ایمان لائے(یعنی ایمان حقیقی تک پہنچ گئے۔نوٹ کیجیے کہ اس آیت میں پہلا ایمان وہ ہے جسے قانونی ایمان کہنا چاہیے‘یعنی جس کے ساتھ عمل صالح علیحدہ حیثیت سے آتا ہے‘ اور دوسرا ایمان وہ حقیقی ایمان ہے کہ جس میں عمل کی کیٹیگری علیحدہ نہیں رہی بلکہ وہ اس کا جزولاینفک ہے۔چنانچہ امام بخاریؒ کاقول ہے کہ اَلُاِیُمَانُ قَوُلٌ وَعَمَل)۔اوراس کے بعد جب تقویٰ اور بڑھا تواب وہ احسان کے درجے پرفائز ہوگئے۔وَاللّٰهُ یُحِبُّ الُمُحُسِنِیُن اور اللہ تعالیٰ کے محبوب تو وہی ہیں جومحسنین میں شامل ہیں۔

اس ضمن میں ایک حدیث رسول ﷺ بھی نوٹ کیجیے کہ "مَاابْتَدَعَ قَوْمٌ بِدْعَةً اِلَّا نَزَعَ اللّٰهُ عَنْهُمْ مِنَ السُّنَّةِ مِثْلَهٗ" کہ جہاں کوئی بدعت آئے گی وہاں سے کوئی نہ کوئی سنت یقیناً رخصت ہو جائے گی۔ ہر بدعت قامعِ سنت ہے۔ ہر بدعت لازماً کسی سنت کا ازالہ کرے گی یعنی اسے DISPLACE کرے گی۔ لہٰذا یہاں پر تصوف کے لفظ نے احسان کی خالص دینی اصطلاح کی جگہ لے لی۔

(ii) **کتاب وسنت کے شیدائیوں میں تصوف سے بُعد** اس ہمالیہ ایسی غلطی کا دوسر انتیجہ وہ نکلا جو میرے نزدیک پہلے سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ یعنی کتاب وسنت کے شیدائیوں میں اس سے بُعد پیدا ہو گیا۔ گویا عنوان سے بُعد ہوا تو اس کے CONTENTS سے بھی دوری پیدا ہو گئی اور نتیجتاً نری ظاہر پرستی باقی رہ گئی۔ اگرچہ صرف عنوان ہی کی وجہ سے بُعد نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی دیگر وجوہات بھی تھیں جنہیں ہم آگے چل کر سمجھیں گے۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ قلبی وذہنی بُعد کا آغاز عنوان کی تبدیلی ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ اور دوری کے اس عمل (PHENOMENON) کا نقطۂ عروج ہے محمد بن عبدالوہابؒ کی شخصیت۔

تصوف پر اس انداز سے اعتراض کیا جائے کہ یہ دور نبویؐ کے بعد کی پیداوار ہے تو جواباً کہا جاتا ہے کہ دیگر علوم بھی تو حضور ﷺ کے زمانے میں نہیں تھے۔ لیکن تصوف کے سوا دیگر علوم کے عنوانات قرآن و حدیث ہی سے ماخوذ ہیں۔ مثلاً ''تفسیر'' کا لفظ قرآن مجید میں آیا ہے: "احسن تفسیرا" اور یہ لفظ دور صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی مستعمل تھا۔ اسی طرح تفقّہ کا لفظ قرآن میں ہے، اور حضور ﷺ کی حدیث ہے کہ "اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِی الدِّیْن"۔ یہ دوسری بات ہے کہ علم دین کے ایک خاص شعبہ کو فقہ کہہ دیا گیا لیکن یقیناً وہ بھی تفقہ کا جزو ہی ہے۔ اسی طرح حدیث کا لفظ بھی قرآن میں ہے: "فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ"۔ یہ قرآن بھی ''حدیث'' ہی ہے۔ لیکن قرآن حدیث اللہ ہے، اور جسے اصطلاح میں حدیث کہتے ہیں وہ حدیث رسول ﷺ ہے۔ لہٰذا ہمارے تمام دینی علوم کا منبع وسرچشمہ قرآن اور حدیث رسول ﷺ ہیں اور ان کے عنوانات بھی قرآن وحدیث ہی سے ماخوذ ہیں۔ لہٰذا میں اس دلیل کو تسلیم نہیں کرتا کہ جیسے اور دینی علوم ہیں ویسے ہی تصوف بھی ہے۔ اس لئے کہ آپ نے عنوان ہی جدا کر دیا اور ایک ایسا لفظ اختیار کر لیا

جس کا کتاب وسنت کے ساتھ سرے سے تعلق نہیں اور مستزاد یہ کہ اس کا یہ بھی کچھ پتہ نہیں کہ یہ کہاں سے آیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جس شخص کو کتاب وسنت سے لگاؤ اور تمسک ہے اور جس کی شخصیت میں کتاب وسنت راسخ ہو چکے ہیں اسے یقیناً تصوف سے بُعد نہ سہی حجاب تو ضرور محسوس ہوگا۔ لہٰذا تصوف سے بُعد کی پہلی وجہ تو اس کا اجنبی عنوان ہی ہے اور اس بعد میں دیگر اسباب کی وجہ سے اضافہ ہوتا چلا گیا کیونکہ اس فکر میں جو بیرونی نظریات اور فلسفے آئے ان سے وہ حجابات بڑھتے گئے یہاں تک کہ انہوں نے منافرت کی شکل اختیار کر لی۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے تصوف سے دوری کی سب سے نمایاں مثال محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ ہیں ویسے مَیں انہیں بھی مجددین کی فہرست میں شامل کرتا ہوں کہ انہوں نے بدعات کا قلع قمع کیا غیر اسلامی رسومات کی بیخ کنی کی دین کی تعلیمات پر جو جھاڑ جھنکار آ گیا تھا اسے ہٹایا اور کم از کم دین کے عملی اور ظاہری پہلو کو نکھارنے کا کام سرانجام دیا اس پہلو سے وہ مجددین امت میں شامل ہیں لیکن اگر محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ کا ان کے ہمعصر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ سے تقابل کیا جائے تو محمد بن عبدالوہاب کی شاہ ولی اللہ کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں ہے شاہ صاحب کی جامعیت کبریٰ کو ذہن میں رکھیے کہ وہ ظاہر و باطن دونوں کے جامع ہیں جبکہ محمد بن عبدالوہاب کی حیثیت صرف دین اور کتاب وسنت کے ظاہری پہلو کے حوالے سے ہے۔

یہاں ضمنی طور پر اس بات کو بھی سمجھ لیجیے کہ عہد حاضر میں تجدیدی اور احیائی تحریکوں میں دین کے باطنی پہلو کے مفلوج ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان تمام تحریکوں کے سامنے ایک مثال اور امام کی حیثیت سے محمد بن عبدالوہابؒ کی نجدی تحریک رہی ہے۔ اس لئے کہ یہی ایک تحریک تھی جس نے اسلام کا قانونی نظام دوبارہ قائم کیا شریعت کا نفاذ کیا شعائر دین کی پابندی شروع کی اگرچہ انہوں نے یہ کام آل سعود کے تعاون سے کیا اس کے باوجود یہ تحریک تجدید واحیائے دین کی تمام تحریکوں کے لئے ایک مثال بن گئی۔ اس ضمن میں ابن تیمیہؒ کا نام بھی آتا ہے لیکن ان کی شخصیت بہت مختلف تھی۔

تصوف کا منصوص ومسنون طریق

اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں یعنی تصوف کا طریقِ منصوص ومسنون

تھا کیا؟ میرے نزدیک جو طریقہ کتاب وسنت سے منصوص ہے وہی طریق محمدیؐ ہے اور وہی طریقہ درحقیقت عقل ومنطق سے قریب بھی ہے۔

اس ضمن میں پہلی قابل توجہ بات وہی ہے جو تنظیم اسلامی کی قرارداد تاسیس کے اولین جملے میں بیان ہوئی ہے یعنی یہ کہ ''دین کا اصل مخاطب فرد ہے''۔ مطلب یہ ہے کہ ہر انسان اللہ تعالیٰ کے باغ کا ایک حسین پودا ہے' اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ پودا پروان چڑھے' اس میں جو بھی امکانات اس نے ودیعت فرمائے ہیں وہ بروئے کار آئیں' اس کی شخصیت پھول کی مانند کھلے مجھے بیدل کا شعر یاد آ گیا'

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو وسمن درا
تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درا

یہ شعر میرے استاد مولانا منتخب الحق قادری نے ایک کلاس میں پڑھا تھا اور اگرچہ میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا لیکن یہ ان کے پڑھنے کے انداز کا اعجاز تھا' اور میرے ذہن کی مناسبت کا مظہر' کہ یہ شعر مجھے اسی وقت یاد ہو گیا۔ شاعر کہتا ہے کہ بڑا ہی ستم کا معاملہ ہے' بڑا ظلم ہے کہ تجھے خواہش نفس کھینچ کر لے جاتی ہے کہ چلو باغ میں سرو وسمن کی بہار دیکھیں۔ حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ تو خود ایک کھلا ہوا غنچہ ہے' اپنے دل کا دروازہ کھول اور جو باطنی چمن اللہ تعالیٰ نے تیرے باطن میں کھلا رکھا ہے کبھی اس کی سیر بھی کر! تم جو خارج کے پھولوں کی سیر کرتے پھرتے ہو کبھی اپنے من میں ڈوب کر بھی دیکھو۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہر انسان اللہ کا لگایا ہوا پودا ہے اور اللہ چاہتا ہے کہ یہ پھلے پھولے' کھلے' کھلے' اس کی شخصیت پروان چڑھے، اس کے اندر کے تمام محاسن ظاہر ہوں' تمام امکانات جو اس میں POTENTIALLY ودیعت کیے گئے ہیں وہ بروئے کار آئیں۔ یہاں پر سورۂ مائدہ ہی کہ وہ آیت یاد کیجیے جس میں کہا گیا ہے کہ عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ یعنی ہر انسان پر اصل ذمہ داری اس کی اپنی ہے دوسروں کے لئے دعوت، تلقین، تبلیغ، نصیحت جو بھی ممکن ہو کرے؛ اس لیے کہ یہ کام فرائض کے درجے میں ہیں۔ لیکن اگر میری کوشش کے باوجود کوئی نہیں مانتا تو اپنے اعمال کا ہر شخص خود جوابدہ ہے' میری اصل ذمہ داری

میری ذات کی حد تک ہے اگر میری کوتاہی ہوگی تو میں پکڑا جاؤں گا۔ لہٰذا مجھے اس حوالے سے سوچنا چاہیے کہ میں اپنے فرائض ادا کروں۔ جہاں تک دوسروں کا تعلق ہے اس ضمن میں یہ اصول بیان فرمادیا گیا ہے کہ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ آپ سے تو مواخذہ نہیں ہوگا کہ یہ لوگ کیوں جہنم میں چلے گئے۔

سورۂ مائدہ کی مذکورہ بالا آیت کا غلط مفہوم بھی لیا گیا ہے‘ اور یہ غلطی دورِ صحابہ ؓ ہی میں ہونے لگی تھی۔ لوگوں نے اس آیت کو دلیل بنایا اس بات پر کہ ہمیں دعوت و تبلیغ یا نصیحت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس دور میں بھی ہر طرح کے لوگ موجود تھے‘ منافقین بھی تھے اور اپنے فرائض سے جی چرانے والے بھی۔ لہٰذا اس وقت حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے خطبے میں ارشاد فرمایا کہ تم اس آیت کا غلط مفہوم لے رہے ہو‘ عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ سے مراد یہ نہیں ہے کہ تم دعوت و تبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضے سے بری ہو گئے ہو۔ تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ ہر شخص پر اصل ذمہ داری اس کی اپنی ذات ہی کے حوالے سے عائد ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول قرآن میں نقل ہوا ہے کہ: رَبِّ اِنِّيْ لَا اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ کہ اے رب میرا اختیار تو صرف اپنے نفس پر اور اپنے بھائی (ہارون علیہ السلام) پر ہے۔ یہاں بھائی کا ذکر بھی صرف اس لئے آ گیا کہ وہ خود تیار تھے‘ ورنہ ظاہر ہے کہ اپنے بھائی پر بھی کسی انسان کو اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح فرمایا کہ: اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ یعنی ''اے نبی! آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے‘ یہ تو صرف اللہ کے اختیار میں ہے کہ جسے چاہے ہدایت سے نواز دے''

انسانی شخصیت کے ارتقاء کے دو پہلو

لہٰذا پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر انسانی شخصیت کا ارتقاء ہونا ہے اور اس شخصیت کی تعمیر یعنی اس میں ودیعت شدہ POTENTIALITIES کو بروئے کار لانا ہے تو یہ کام کس طرح ہوگا؟ یہاں اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے کہ انسان کا وجود دو اجزائے ترکیبی پر مشتمل ہے جو باہم متضاد ہی نہیں ایک دوسرے کے مخالف بھی ہیں۔ متضاد کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ دو چیزوں میں باہم تضاد پایا جاتا ہو‘ اور ضروری نہیں کہ ان میں مخالفت اور کشمکش بھی ہو رہی ہو۔ جبکہ مخالفت کا مفہوم یہ

ہے کہ ان کے مابین رسہ کشی یا کھینچ تان کی کیفیت بھی ہے۔ انسانی شخصیت کے اندر دو متحارب اور باہم مخالف اور متضاد عناصر اس کا نفسِ حیوانی اور اس کی روح ملکوتی ہیں۔ لہٰذا کرنے کا کام یہ ہے کہ روحانی عنصر کی تقویت وتغذیہ کا سامان کیا جائے اور دوسری طرف حیوانی عنصر کی ''تہذیب'' و تزکیہ کا بندوبست کیا جائے۔ اس عمل اور جدوجہد کے دو رخ (ASPECTS) ہوں گے۔ اس بات کو اس حدیث کے حوالے سے سمجھئے جس میں بتایا گیا ہے کہ رمضان کے دنوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی منادی ندا کرتا ہے: یَا بَاغِی الْخَیْرِ اَقْبِلْ وَیَا بَاغِی الشَّرِّ اَدْبِرْ! یعنی اے خیر کے طالب آگے بڑھ کہ یہ نیکیوں کا موسم بہار ہے اور اے شر کے طالب پیچھے ہٹ اور لوٹ جا! ہمارے اندر بھی ایک خیر کا عنصر ہے اسے تقویت دیجیے' اس کی تقویت وتغذیہ کا اہتمام کیجیے' یہ ایک رخ ہو گیا۔ دوسرا رخ جو شر کی طرف کھینچنے والا عنصر ہے اس کو دبائیے' اسے CONTAIN کیجیے ' اس کی تہذیب کیجیے' اس کا تزکیہ کیجیے۔

اس تہذیب و تزکیہ کا مقصد نفس کو فنا کر دینا نہیں ہے۔ ضبطِ نفس یعنی SELF-CONTROL اور تہذیب وتزکیہ نفس یعنی SELF-PURIFICATION ' یہ دونوں چیزیں مطلوب ہیں۔ لیکن نفس کُشی یا SELF-ANNIHILATION کا اسلام میں کوئی تصور نہیں ہے۔ یہ چیز دراصل باہر سے آئی ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے انسانوں کی جو اقسام بیان کی ہیں وہ انہی دو عناصر کی بنیاد پر ہیں یعنی قوت ملکوتی اور قوت بہیمی۔ سب سے بلند درجے پر وہ لوگ ہیں جن کی ملکیت بھی بہت قوی اور بہیمیت بھی بہت قوی ہے؛ اس لئے کہ قوت کار اور قوت عمل دراصل بہیمیت ہی سے متعلق ہے اور سب سے نچلے درجے پر وہ لوگ ہیں جن کی بہیمیت قوی اور ملکیت ضعیف ہے۔ بہرحال نوٹ کیجیے کہ اسلام میں نفس کشی یا SELF-ANNIHILATION کا کوئی مقام نہیں ہے البتہ ضبط نفس یعنی SELF-CONTROL کا حصول مطلوب ہے جسے میں تہذیب نفس کہہ رہا ہوں اور دوسری مطلوب شے ہے تزکیہ نفس یعنی SELF-PURIFICATION ــــــــــ ان دونوں کا ایک نتیجہ نکلتا ہے جس کے لئے میں نے ایک نئی اصطلاح وضع کی ہے یعنی "تحریرُ الرُّوح"۔ میں یہاں ''تحریر'' کا لفظ اس کے بنیادی لغوی مفہوم یعنی حریت کے معنی میں استعمال کر رہا ہوں۔

تحریر الروح یعنی LIBERATION OF THE SOUL OR SPIRIT یہ نکتہ ''عظمت صوم'' نامی کتابچے میں بیان ہو چکا ہے کہ نفس حیوانی کا غلبہ جتنا شدید ہوگا اسی قدر ہماری روح ان بیڑیوں میں مقید رہے گی' اور نفس حیوانی کا غلبہ جتنا کمزور پڑے گا اسی تناسب سے روح کو آزادی ملے گی۔ تہذیب وتزکیہ نفس کا نتیجہ تحریر الروح کی شکل میں نکلتا ہے' یعنی روح درحقیقت نفس امّارہ کے تسلط سے آزاد ہوتی ہے۔

روح کی تقویت کا ذریعہ: ذکرِ الٰہی

اب تک ہم نے یہ سمجھا ہے کہ دین کا اصل مقصود فرد کی تعمیر وترقی ہے۔ فرد مرکب ہے دو متخالف اور متحارب عناصر سے' لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ خیر کی قوت یعنی روح کی تقویت اور تغذیہ کا بندوبست ہو اور شر کی طاقت یعنی نفس امارہ کی تہذیب اور تزکیہ کا سامان کیا جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ روح کی تقویت کا کیا ذریعہ ہے؟ ایک لفظ میں اسے بیان کیا جائے تو وہ ہے ذکر الٰہی۔ اس کا فلسفہ کیا ہے؟ 1965ء میں اپنے مشن کے لئے ذاتی اور انفرادی سطح پر کام کا آغاز کرنے کے بعد میرا جو پہلا کتابچہ شائع ہوا تھا یعنی ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' میں اس میں اس بات کی پوری وضاحت کر چکا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ روح انسانی میں اللہ تعالیٰ کی معرفت موجود ہے ایک شعور خفتہ (DORMANT CONSCIOUSNESS) کی شکل میں! اس لیے کہ ہماری روح اللہ تعالیٰ کی ذات کا جزو تو ہرگز نہیں ہے لیکن صادر تو وہیں سے ہوئی ہے۔ یہ امرِ رب ہے۔ تو کیا یہ روح اندھی اور بہری ہو سکتی ہے؟ معاذ اللہ! البتہ سوئی ہوئی ہے' اور اللہ کا ذکر اس کو بیدار کرتا ہے جناب یوسف سلیم چشتی مرحوم نے ایک مرتبہ جرمن فلسفی کانٹ کا ایک جملہ سنایا تھا:

HUME AWAKENED ME FROM MY DOGMATIC SLUMBER

انگریزی فلسفی ڈیوڈ ہیوم کی کتابیں پڑھ کر کانٹ کہتا ہے کہ میں اپنے اندھے عقیدے کی دھن میں سویا ہوا تھا کہ ہیوم نے مجھے جگا دیا۔ اسی طرح حفیظ جالندھری کی ایک نظم ہے ''جاگ سوز عشق جاگ'' اور میں نے اپنے ہائی سکول کے بالکل ابتدائی زمانے میں ایک گیت سنا تھا جس کے یہ الفاظ آج بھی مجھے یاد ہیں۔

تم ہی نے مجھ کو پریم سکھایا ؎

سوئے ہوئے ہر دے کو جگایا

ہندی میں ''ہردہ'' کہتے ہیں جی یا نفس کو۔تو یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ انسان کی روح میں سب کچھ پہلے سے موجود ہے۔میں نے اپنے کتابچے ''نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت'' میں دو الفاظ استعمال کئے ہیں کہ اس روح کے اندر معرفت ربّ بھی موجود ہے اور محبت رب بھی۔اس کی ہمارے بعض عارفین نے جو مثال دی ہے وہ یہ ہے کہ ہماری روح کا ذات باری تعالیٰ کے ساتھ وہی تعلق ہے جو سورج کی کرن کا سورج کے ساتھ ہے۔سورج کی کرن اپنے SOURCE سے کروڑ ہا میل دور چلی جائے لیکن اس کا تعلق سورج سے منقطع نہیں ہوتا۔

لہٰذا ذکر الٰہی کا اصل فائدہ یہ ہے کہ اس کی بدولت روح بیدار ہوتی ہے اس کا سویا ہوا شعور متحرک (ACTIVATE) ہوتا ہے۔اس ضمن میں سورۂ نور کے پانچویں رکوع کے درس میں جو بحث آتی ہے اس کو بھی ذہن میں تازہ کر لیجیے یعنی یہ کہ نور وحی اور نور فطرت کے امتزاج سے ہی نور ایمان وجود میں آتا ہے اور درحقیقت یہ سارا معاملہ ایمان ہی کا ہے۔ایمان صرف زبانی اقرار تک ہے کہ یہ ''اسلام'' ہے۔جب ایمان دل کی گہرائی میں اتر کر راسخ ہو گیا اور تصدیق بالقلب حاصل ہو گئی کہ مومن یہ محسوس کرنے لگا کہ وہ گویا اللہ کو دیکھ رہا ہے یا کم سے کم یہ استحضار حاصل ہو گیا کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے تو یہ ''احسان'' کی منزل ہے۔واقعہ یہ ہے کہ ''احسان'' کے درجے کو بیان کرنے کے لئے ہماری زبان میں اس سے بہتر کوئی مثال نہیں ہے کہ یہ ایمان کی اس کیفیت کا نام ہے کہ ایک شخص غیبی حقائق کو گویا آنکھوں کے سامنے موجود پائے یقین کی گہرائی کے لئے اس سے آگے کوئی استعارہ اور کوئی تعبیر ممکن نہیں ہے۔ایمان جب اس شدت کو پہنچ جاتا ہے کہ ''کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ'' کی کیفیت حاصل ہو جائے یعنی یہ کہ بندہ اللہ کی عبادت اور اللہ کی رضا جوئی کے لئے عمل اتنی شدت اور خلوص و اخلاص سے کرنے لگے کہ گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے اور اگر وہ اللہ کو نہیں دیکھ رہا تو اللہ یقیناً اسے دیکھ رہا ہے۔تو یہی احسان ہے اور یہی مقام ولایت ہے۔

حصولِ ایمان کے ذرائع

اب یہاں میں اصل موضوع سے کسی قدر ہٹ کر ایک بات بیان کرنا چاہتا ہوں اسے

ایک ضمیمہ سمجھ لیجیے۔اس بات کو میں نے حقیقت ایمان کے موضوع پر ہونے والے محاضرات میں تفصیل سے بیان کیا ہے کہ حصول ایمان کے تین ذرائع ہیں: اولاً یہ کہ صاحب یقین کی صحبت سے ایمان حاصل ہوتا ہے جیسے آپ آگ کی بھٹی کے پاس بیٹھیں گے تو حرارت ملے گی۔ثانیاً یہ کہ شریعت پر عمل پیرا ہونے سے بھی ایمان پیدا ہوتا ہے۔

لیکن یہ دونوں قسم کے ایمان ایک نوع کے BLIND FAITH کے درجے میں ہیں اس میں شعوری یا INTELLECTUAL عنصر ضروری نہیں ہے اس میں فہم و تفقہ بھی ضروری نہیں! اگرچہ ان ذرائع سے حاصل ہونے والے ایمان میں گہرائی تو ہوسکتی ہے لیکن اس میں وسعت فکر ونظر نہیں ہوگی۔وہ ایمان جس میں شدت یقین کے ساتھ ساتھ وسعت فکر ونظر بھی ہو جس میں گہرائی کے علاوہ ایک شعوری یا INTELLECTUAL عنصر بھی ہو ایسا ''علیٰ وجہ البصیرت'' ایمان صرف اور صرف قرآن سے ملے گا۔قرآن کے سوا کسی اور ذریعے سے اس نوعیت کا ایمان نہیں مل سکتا۔ یہاں اس نکتے کو بھی سمجھ لیجیے کہ حدیث کی رو سے ایمان کا افضل ہونا اور شے ہے اور ایمان کا اعجب یا MOST WONDERFUL اور MOST FASCINATING ہونا اور شے ہے۔یعنی ایک ایمان کی افضلیت ہے اور دوسرے ایمان کی اعجبیت ہے۔اہل سنت کے ہاں یہ مسلم ہے کہ سب سے افضل ایمان صحابہ ﷺ کا ہے یہاں تک کہ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کا ایمان بھی بڑے سے بڑے ولی اللہ اور دانشور کے شعوری ایمان سے افضل مانا جائے گا لیکن یہ ذہن میں رکھیے کہ مختلف صحابہ ﷺ کے ایمان میں بھی فرق تھا ظاہر ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی صحبت تو تمام صحابہ ﷺ کو حاصل تھی لہٰذا صحبت سے حاصل ہونے والا ایمان سب میں مشترک تھا لیکن صحابہؓ میں بہت سے فہیم اور باشعور یعنی INTELLECTUAL افراد بھی تھے جنہوں نے قرآن حکیم سے شعوری ایمان اخذ کیا تھا۔لہٰذا یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ معاذ اللہ تمام صحابہ کرام کا ایمان محض BLIND FAITH تھا اگرچہ یہ اپنی جگہ حقیقت ہے کہ صحابہ ﷺ کا غیر شعوری ایمان بھی چونکہ محمد رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے حاصل ہوا تھا لہٰذا وہ قیامت تک افضل رہے گا۔البتہ ایمان کا حسین اور اعجب ہونا ایک بالکل مختلف بات ہے اور یہ راستہ آج بھی کھلا ہوا ہے۔دیکھئے حضور ﷺ نے ہمارے احساس محرومی کے ازالے کے لیے کیسی کیسی باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ایک

مرتبہ فرمایا کہ میری امت کا معاملہ بارش کی مانند ہے نہیں کہہ سکتے کہ اس کا اول حصہ بہتر ہوگا یا آخر۔ لہٰذا اگر ہم حضور ﷺ کے زمانے میں پیدا ہونے سے محروم رہ گئے تب بھی کوئی حرج نہیں کہ صدیقیت اور شہادت او صالحیت کے تمام مراتب آج بھی قابل حصول ہیں۔ صرف نبوت کا دروازہ بند ہے لیکن وہ تو صحابہؓ کے لئے بھی بند تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ مراتب حاصل کرنے کے مواقع موجود ہیں محنت کرو اور اکتساب کرو۔ دوسری وہ حدیث ہے جس میں حضور ﷺ نے صحابہؓ سے سوال کیا کہ تمہارے نزدیک مخلوقات میں حسین ترین (اَعْجَب) ایمان کس کا ہے؟ انہوں نے فرمایا ملائکہ کا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ملائکہ کیسے ایمان نہ لاتے وہ تو اپنے رب کے حضور میں حاضر ہیں ان پر تو حقائق منکشف ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ان کا کیا کمال ہوا؟ صحابہؓ نے کہا کہ انبیاء کا ایمان اعجب ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا وہ کیسے ایمان نہ لاتے ان پر تو وحی نازل ہوتی ہے۔ اس پر صحابہؓ نے عرض کیا کہ پھر ہم ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم کیسے ایمان نہ لاتے جبکہ میں ﷺ تمہارے درمیان موجود ہوں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اَنَّ اَعْجَبَ الْخَلْقِ اِلَیَّ اِیْمَاناً لَاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ یَأْتُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ یَجِدُوْنَ صُحُفاً فِیْهِ کَتَابُ اللّٰهِ فَیُؤْمِنُوْنَ بِمَافِیْهَا یعنی: میرے نزدیک تو سب سے حسین ایمان ہمارے ان بھائیوں کا ہوگا جو میرے بعد آئیں گے (وہ میری صحبت نہیں پائیں گے بلکہ) انہیں تو اوراق ملیں گے جن میں اللہ کی کتاب درج ہوگی اور وہ اس پر ایمان لائیں گے۔

ذکر الٰہی کے ضمن میں قرآن کا مقام

اب تک ہم نے جو بات سمجھی ہے وہ یہ ہے کہ اصل کام روح کو تقویت پہنچانا ہے اس کا ذریعہ ذکر الٰہی ہے اور اس کا حاصل ایمان ہے۔ ذکر الٰہی کے ضمن میں اہم ترین شے قرآن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اپنے آپ کو ''الذکر'' کہتا ہے۔ یہاں الف لام کو خواہ حصر کے لئے سمجھا جائے خواہ جنس کے لئے، دونوں صورتوں میں مطلب یہی ہوگا کہ کل یا کُل ذکر یہی ہے اور جنس ذکر اس قرآن میں محصور ہوگئی ہے۔ تبعاً ذکر میں نماز بھی شامل ہے۔ لیکن نوٹ کیجیے کہ نماز میں بھی دو ELMENTS ہیں ایک عملی ذکر ہے یعنی رکوع، سجود، قیام اور دوسرے خود قرآن ہے۔ چنانچہ قرآن نے فجر کی نماز کو تو کہا ہی ہے ''قرآن الفجر''۔ اسی طرح رات کی تہجد ہے تو وہ بھی قرآن کے

ساتھ ادا کرنا مطلوب ہے۔ تیسرے درجے میں نبی اکرم ﷺ سے روزمرہ معمولات کے ضمن میں جواذکار منقول ہیں ان کی پابندی کی جائے تو یہ بھی ذکر الٰہی کی ایک صورت ہوگی۔

تزکیۂ نفس ایمان اور احسان کے حوالے سے جو بات ہم نے سمجھی ہے اسے صوفیاء کی اصطلاحات کے حوالے سے بھی سمجھ لیں۔ میں نے شروع میں ''تجلیۂ روح'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ صوفیاء کہتے ہیں کہ جیسے سورج کی ایک کرن ہو جو کسی سبب سے ٹھنڈی پڑ گئی ہو بس ایسا ہی روح کا معاملہ ہے ذکر الٰہی کے ذریعے گویا آپ نے دوبارہ حرارت پہنچانا شروع کی۔ اس کی روشنی ماند پڑ گئی تھی آپ نے اسے دوبارہ روشن کرنا شروع کیا۔ یہ تجلیہ ہے! اور یہاں بھی میں لفظ ''تحریرالروح'' کو لانا چاہتا ہوں لیکن یہاں ''تحریر'' کا لفظ حرارت سے ہے۔ روح کا تجلیہ اور روح کو حرارت بہم پہنچانا یہی ذکر کا اصل نام ہے۔ البتہ ذکر کے ضمن میں اصل شے قرآن ہے پھر نماز آتی ہے اور اس کے بعد اذکار مسنونہ ہیں۔

تحریرالروح' کا منطقی نتیجہ

اس نئی اصطلاح ''تحریرالروح'' کے جو دو معانی میں نے بیان کیے ہیں یعنی ایک آزاد کرنا اور دوسرے حرارت پہنچانا' تو اس عمل کا منطقی نتیجہ وہ ہے جسے حکیم فلاطینوس (PLOTINUS) نے نہایت خوبصورت الفاظ میں بیان کیا ہے۔ یعنی FLIGHT TO THE ALONE TO THE ALONE درحقیقت ہماری روح بھی' بلاتشبیہ' ذات باری تعالیٰ کی طرح انتہائی تنہا ہے۔ روح کا کسی سے کوئی رشتہ نہیں' روح کسی کی باپ ہے نہ کسی کا بیٹا' نہ کسی کا شوہر نہ کسی کی بیوی۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ جدید فلسفے میں بھی وجودیت کے حوالے سے ''کرب'' کا لفظ کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ جو شخص بھی ذہنی اور نفسیاتی اعتبار سے بلند ہونا شروع ہوتا ہے اس میں تنہائی کا احساس بڑھنے لگتا ہے' گویا جتنا اس کے اندر تنہائی کا احساس شدید ہوگا اسی قدر وہ حیوانی سطح سے بلند ہوتا جائے گا۔

چنانچہ ایک طرف انسانی روح کی یہ مطلق ''انفرادیت'' (INDIVIDUALITY) ہے اور دوسری طرف وہ ذات ہے جو ''اَلْاَحَـــد'' ہے اور جس کی ''فردیت'' میں کسی بھی نوع کی ثنویت کا سرے کوئی احتمال تک نہیں ہے!

اب اس قاعدہ کلیہ کے مطابق کہ ہر شے اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے اور اپنے مرکز اور SOURCE کی جانب رجوع کرتی ہے روح انسانی کا اصل رجحان اللہ تعالیٰ کی جانب ہے۔ گویا روح کی مثال ایک پرندے کی سی ہے جو جسم اور حیوانیت کے پنجرے میں مقید ہے۔ یہ پرندہ پھڑ پھڑاتا ہے اور قید سے آزاد ہو کر اوپر اٹھنا چاہتا ہے چنانچہ اسی کو حکیم فلاطینوس نے ''تنہا'' کی پرواز ''تنہا'' کی جانب سے تعبیر کیا ہے جس میں ہم احتیاطاً اضافہ کر سکتے ہیں کہ: ''محدود تنہا'' کی پرواز ''لامحدود تنہا'' کی جانب! یہاں اقبال کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

مَرا دل سوخت بر تنہائیٔ اُو
کنم سامانِ بزم آرائیٔ اُو
مثالِ دانہ می کارم خودی را
برائے او نگہ دارم خودی را

یعنی میرا دل جلتا ہے اس صدمے اور رنج سے کہ اللہ اکیلا ہے' تنہا ہے۔ لہٰذا میں اس کی محفل سجانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جیسے دانے کو پروان چڑھایا جاتا ہے تو وہ پودا بنتا ہے کسان اسے پالتا اور پوستا ہے اسی طرح میں اپنی خودی کی پرورش کر رہا ہوں اسے پال پوس رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے لئے اپنی خودی یعنی اَنا یا روح کی حفاظت کر رہا ہوں۔

بہرحال ان فلسفیانہ اور شاعرانہ خیال آرائیوں سے قطع نظر' اب تک کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ روح کی تقویت کا سامان کرنا ہر انسان کے لئے لازم ہے جس کا ذریعہ ایک لفظ میں بیان کریں تو وہ ''ذکر'' ہے اور اس کی شرح کریں تو سب سے بڑا ذکر خود قرآن ہے پھر نماز اور پھر ادعیہ واذکار مسنونہ۔ اس سے تجلیہ روح کا مقصد حاصل ہوگا اور ایمان کی شدت اور گہرائی میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا یہاں تک کہ انسان ''احسان'' کو پالے گا۔

امام حضرت تقی الدین بن ابوالعباس احمد المعروف

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ

(1263ء___1328ء)

انجینئر مختار فاروقی

پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی وفات کے 650 سال بعد حالات یکسر بدل چکے تھے۔ اسلام کی تعلیمات اور مسلمان اس عرصے کے دوران کئی نشیب وفراز سے گزر کر ایک گہرے نشیب اور زوال سے دوچار تھے کہ امام ابن تیمیہ کی ولادت 1263ء میں ہوئی ہے۔

سیاسی حالات

خلافت راشدہ 11ھ تا 40ھ (632ء تا 661ء) دور بنو امیہ 40ھ تا 132ھ

(661ء تا750ء) کے بعد دور بنوعباس کا آغاز ہوا۔ بنوامیہ عرب تھے اور بنی اسماعیل ہی کی شاخ تھے۔ جبکہ بنوعباس بھی حضرت محمد ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب کی اولاد میں سے تھے اور بنی اسماعیل میں سے ہی تھے۔

دور بنوعباس 525 سال کے طویل عرصے پر محیط ایک عظیم وسیع اور بے مثال حکومت کا نام ہے۔ ان 525 سالوں میں پہلے 115 سال بنوعباس کا دور عروج اور مسلمانوں کو بحیثیت ایک قوم اور ملت تمام عالم پر فضیلت اور فوقیت کا دور ہے۔ اس دور میں اگرچہ اسلامی فتوحات کا سلسلہ رُک گیا اور حقیقی اسلام کی تعلیمات ماند پڑ گئیں اور اسلامی انقلاب کی تصدیر (EXPORT) کی صلاحیت مفقود ہوگئی تاہم بے جان مذہبیت اور فرقہ پرستی کے جلو میں غیر اسلامی نظریات کی یلغار کی وجہ سے اب میدان جنگ سرحدوں پر نہیں بلکہ مدارس، تعلیم گاہوں اور شاہی درباروں میں سجنے لگے اور دشمنوں کے خلاف ''جہاد'' کی جگہ آپس میں ''جہاد'' اور لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا جس میں تلوار، توپ و تفنگ اور منجنیقوں کے بجائے، منطقی بحثیں، کلامی موشگافیاں فتوے اور مسلمانوں کی باہمی تقسیم در تقسیم کے عمل کا ''مصالحہ'' استعمال ہونے لگا۔

اس دور میں سرکاری سطح پر سارا زور امن و امان کے قیام اور داخلی استحکام پر رہا اور حکمرانوں کے لئے واحد راستہ DIVIDE AND RULE کا نظریہ رہا اور مذہبی منافرتوں نے حکمرانوں کی عیاشیوں کے باوجود ان کے دور اقتدار کو طول دینے میں مدد دی۔

تاہم اسی دور میں مجموعی طور مسلم کلچر، رہن سہن کے طریقے، ایجادات اور ضروریات زندگی کی فراہمی میں بے مثال ترقی ہوئی اور معاشی طور پر صرف خواص ہی نہیں عوام بھی خوشحال ہو گئے اگلے دوسو سال باہمی خلفشار اور پھر مزید 225 سال دشمنوں کی ریشہ دوانیاں اور مرکز گریز عناصر کا طاقت حاصل کر کے علیحدگی کے رجحانات میں شدت کا دور ہے اسی دور میں سارا یورپ متحد ہو کر آیا 1090ء کے لگ بھگ مسلمانوں کے ہاتھوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مفتوحہ بیت المقدس چھین لیا اور عرب اس کا دفاع نہ کر سکے اور یہ صلیبی غلبہ تقریباً ایک صدی جاری رہا اور بجا طور پر اسے صلیبی جنگوں کا نام دیا گیا تھا کہ اس میں پورا عالم عیسائیت عالم اسلام کے خلاف صف آرا ہو گیا تھا اور قسطنطنیہ اس کا مرکز تھا۔ بنوعباس کے زوال کے باعث بیت المقدس کی واپسی عربوں

سے ممکن نہیں ہوسکی بلکہ یہ سعادت علاقائی حکمرانوں میں دمشق میں مسلمان حکمران خاندان کے سپوت نورالدین زنگی رحمۃ اللہ اوراس کے بھتیجے صلاح الدین ایوبی کے حصے میں آئی کہ 1192ء میں بیت المقدس صلیبی چنگل اوراقتدار سے چھین کر پھر عالم اسلام میں شامل کردیا۔

اس پر بس نہیں بنوعباس کے حکمرانوں کی دین سے دوری، عیش پرستی اورالف لیلوی داستانیں تاریخ کا حصہ ہیں اور بغداد کے شہزادے پوری دنیا میں عیاشی کی علامت (SYMBOL) بن گئے تھے۔اور بعد کی کئی صدیوں تک ذہنوں پر چھائے رہے۔

ان حالات میں ہلاکوخان اور چنگیز خان کی فوجوں نے بنوعباس کی حکومت کا سارا شمالی علاقہ تافت وتاراج کردیا اور بالآخر سلطنت سمٹ کر بغداد میں رہ گئی تو 1258ء میں حملہ کر کے آخری عباس خلیفہ کو دردناک انداز میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔اور یوں پانچ صدیوں پر محیط بنوعباس کے اقتدار کا سورج غروب ہوگیا اس سقوط بغداد کے واقعہ کے بعد کئی سال تک عالم اسلام پر خاموشی اور ہیبت چھائی رہی اور سر اٹھانے اور دشمنوں سے مقابلہ کرنے کی جرات وہمت مفقود ہو گئی۔

اس پس منظر میں 1263ء میں حران کے مقام پر امام ابن تیمیہ کی پیدائش اوراس خارجی ماحول میں ان کی پرورش اورتعلیم ہوئی ہے لہٰذا مسلمانوں کی زبوں حالی ایمان کی کمزوریوں اورایمانی کیفیات کا بے جان ہو جانا، دین سے اعراض، دنیا پرستی، دشمنوں کا خوف اورنفسانفسی کا ماحول ہے جس کا اثر امام موصوف کی طبیعت پر ہوا اوراس سے ان جیسی سعید روح نے اسلام کی عظمت کے لئے کام کرنے کی ٹھانی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ہمت دی اور وسائل بھی اوراعوان و انصار بھی ایسے میسر آ گئے کہ وہ ساری زندگی مسلمانوں کی بیداری اورقرآن وسنت کی طرف رجوع کے لئے کوشاں رہے۔

کوئی شخص ان کی آراء اورفتاویٰ سے اختلاف تو کرسکتا ہے یہ اس کا حق ہے تاہم ان کی بے لوث خدمات، حق کی حمایت، باطل کے خلاف تیغ بے نیام ہونے کے جو تمغے ان کے کردار کا حصہ ہیں اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اسلام دشمن ابلیسی طاقتوں کی سرگرمیاں

اسلام کے قرن اول میں خلافت راشدہ جیسے شاندار آغاز کے بعد چھ صدیوں تک بنی اسماعیل کے ہاتھ سے اسلامی اقتدار اور قیادت چھن جانے کا تذکرہ کرتے ہوئے اسلام دشمن ابلیسی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا تذکرہ نہ کرنا تاریخ کے ساتھ بڑا ظلم ہوگا۔

اسلام کے لئے مسلمانوں کی نظریاتی پختگی، ایمانی کیفیات اور جذباتی لگاؤ میں وقت کے ساتھ ساتھ کمی آ جانا معمول کی بات ہے اور عین فطرت انسانی ہے اور اس قانون خداوندی اور آفاقی سچ سے ''ذوی العقول'' میں سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا تا ہم ________ اگر کوئی نادیدہ قوت اور ابلیسی گروہ کسی حق پرست گروہ کے درپے ہو جائے اور اس کو گزند پہنچانے اور راہ حق سے ہٹائے (DERAIL) کرنے کو اپنا مشن بنا لے اور سارے جائز ناجائز وسائل اور طریقے استعمال کر دے اور اس کے نتیجے میں حق پرستی کا پرچم سرنگوں ہو جائے تو اپنوں کی کوتاہیوں کے تذکرے کے ساتھ ساتھ غیروں کا ماتم کرنے اور ان کی بے اصولیوں، وعدہ خلافیوں اور مارآستیں بن کر کاٹنے کے عمل کا تذکرہ کرنے کو جی ضرور چاہتا ہے۔

عالمی ابلیسی قوت جس کا سب سے بڑا مظہر اور علمبردار گروہ مجموعی طور پر بنی اسرائیل ہے اور اس میں سے بھی یہود اور عیسائیوں کا پروٹسٹنٹ (PROTESTANT) گروہ ہے۔

ملک یمن کے عیسائی حکمران ابرہہ کے مکہ پر حملہ کر کے حضرت محمد ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری (میلاد النبی ﷺ) کو سبوتاژ (SEBOTAGE) کرنے کے واقعہ سے لیکر میثاق مدینہ کی خلاف ورزیاں، بنی نضیر، بنی قینقاع، بنی قریظہ کی سازشیں خیبر سے اخراج، دومتہ الجندل میں سرکوبی انہیں کے اٹھائے ہوئے فتنے دجالوں (جو مدعی نبوت بھی تھے) کا خاتمہ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں حضرت محمد ﷺ کی وصیت کے عین مطابق کہ، اخرجوا الیہود و النصاریٰ من جزیرۃ العرب (یہود و نصاریٰ کو جزیرہ عرب سے نکال دو) پر عمل درآمد، نیز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور مبارک میں ان کا بلوائیوں کے خلاف طاقت استعمال نہ کرنے کا عزم

جس سے ان ابلیسی طاقتوں کے اسلام کے خاتمے کے فوری منصوبے خاک میں مل گئے۔(یاد رہے کہ سیاسی اعتبار سے جوابلیسی تحریک دشمنان اسلام نے جوان کی تھی اوراس کے اثرات مدینے تک آ گئے تھے اگراس کے خلاف طاقت استعمال کی جاتی جو کہ ان کے VISION کے مطابق لازمی ہونا تھا۔اور یوں آناً فاناً جلدی اسلام کی تعلیمات،صحابہ کرام ﷺ اورقرآن مجید کوختم کر دیا جاتا یہ حضرت عثمان ﷺ کی مومنانہ فراست بصیرت باطنی تھی کہ انہوں نے طاقت استعمال نہ کر کے ان کے سارے منصوبے خاک میں ملا دیئے اور وہ ابلیسی منصوبہ جو چند مہینوں کا تھا وہ سقوط بغداد کی شکل میں چھ صدیوں بعد عملی شکل میں سامنے آ سکا۔اپنے مقاصد کے حصول کے لئے در پردہ ابلیسی طاقتوں نے مسلمانوں کو باہم لڑا دیا اور حضرت علی ﷺ سے لیکر سقوط بغداد تک ہزاروں عنوانوں سے اپنے مقصد کی طرف پیش قدمی کو ممکن بنایا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ کا تذکرہ سابقہ شمارے میں آ چکا ہے اس دور میں شمالی افریقہ کے علاقے میں اس گروہ مسلمانوں میں سے ہی بعض ایسی قوتوں کو کھڑا کیا اوران کی مدد کر کے مرکز سے لڑا دیا۔اور مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا فاطمی خاندان 909ء__ 1171ء شمالی افریقہ(بشمول مصر) پر چھایا رہا اوراس کی سرگرمیاں حقیقی اسلامی خدمات کے کس قدر خلاف تھیں کہ انہوں نے ایک وقت میں مکہ پر حملہ کیا بیت اللہ کو آگ لگا دی حج کئی سال موقوف رہا اور حجر اسود اکھاڑ کر ساتھ لے لئے اور ایک عرصہ تک فاطمی حکمرانوں کے لئے تخت کے ساتھ پائیدان کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔

اس سیاسی اور جغرافیائی پس منظر میں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ نے آنکھ کھولی۔1258ء کے سقوط بغداد اور ہلاکو خان اور، چنگیز خان (تاتاریوں) کی دہشت کی وجہ سے مسلمان پست ہمتی کا شکار تھے اور دشمن کی مرعوبیت کے ساتھ ذہنی پس ماندگی بھی عام تھی گزشتہ دو تین صدیوں میں یونانی فلاسفہ کی کتابوں کی بھرمار کی وجہ سے امت کا ذہین طبقہ اس طرح کھچا چلا جا رہا تھا اوراس کے زیر اثر عوام میں مایوسی اور دین سے دوری کے ساتھ بدعملی نے بھی قدم جما لئے تھے النصر فارابی(870ء__ 990ء) ابن سینا(970ء__ 1037ء)عمر خیام (1039ء__

1131ء) ابن رشد (1126ء__1198ء) مسلمانوں میں سے اٹھ کر عجمی فلسفوں کا پرچار کر رہے تھے اور ولی، جنت، دوزخ، آخرت، فرشتے سب چیزیں عقل کی یونانی ترازو میں تول کر رد کرنے کا رجحان دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔

ان عجمی فلسفوں اور نظریات کے فروغ پذیر ہونے پر فطری طور پر مسلمان زعماء اور وارثانِ علوم نبوت میں جو ردّ عمل سامنے آیا وہ دو قسم کا تھا۔ پہلا طبقہ ایسے افراد پر مشتمل تھا جو عجمی (یونانی، ایرانی، ہندی وغیرہ) نظریات کا دفاع دلیل کے ساتھ کرنے کو ترجیح دے رہا تھا اور دور بنوعباس کے آغاز میں دوسری صدی ہجری (750ء کے بعد) ابھی اسلامی جذبات اور ایمانی کیفیات کے ادوار کے مقابلے میں بہت تیز تھے اور اسلامی جذبات میں اور امت مسلمہ کی اجتماعی یادداشت میں ابھی دور خلافت اور اس کے بعد کے ادوار میں جہاں صحابہ کرام ﷺ کی مسحور کن شخصیات کا سحر ابھی تازہ تھے۔_____ لہٰذا ایمان اور مابعد الطبعاتی حقائق کو موضوع بحث بنانے اور ان پر یقین رکھتے ہوئے عقل وفطرت کے دلائل سے یونانی فلاسفہ کے نظریات کا دفاع کرنے کے عمل کا آغاز ہوا۔

یہ سوچ، انداز کلام اور بات سمجھانے اور ابلاغ کا انداز چونکہ ماضی کے مقابلے میں مختلف تھا لہٰذا شروع شروع میں اس میں بڑا جوش جذبہ، ولولہ، ایمانی کیفیات اور یقین واذعان نمایاں تھا۔ صاف ظاہر ہے دور نبوی ﷺ میں فریق مخالف کی بات کا جواب وحی آسمانی سے آتا تھا اور آتا تھا۔ لہٰذا اس دور کی خصوصیت یہ تھی۔ کہ حضرات صحابہ کرام ﷺ کسی سوال پر اللہ ورسولہ اعلم کا مختصر اور مُسکت سے جواب دیتے تھے۔ دور صحابہ ﷺ میں کسی بات میں اختلاف پر قرآن مجید کے ساتھ فرمان رسالت ﷺ کا حوالہ کافی سمجھا جاتا تھا کہ اس میں ہر مسئلے کا حل اور ہر سوال کا شافی وکافی جواب مضمر ہے۔

تاہم دور صحابہ ﷺ کے بعد اب بات یقیناً قرآن وسنت (یا قرآن وحدیث) سے استدلال کی تھی اور اس میں مسلمانوں کے باہمی نزاعات اور اختلافات میں بھی ''رائے'' اور ''اجتہاد'' کا دخل ہو گیا تھا اور ''اجتہاد'' کا یہ راستہ اسلام کے پھیلاؤ، بین الاقوامیت اور توسیع کے

لئے ہمیشہ مثبت ہتھیار سمجھا گیا ہے۔

اس طرز بحث سے آہستہ آہستہ ایک پورا دبستان وجود میں آ گیا جو عقل وفکر، حالات حاضرہ، ماحول کے مطابق قرآن وحدیث کے احکامات کی وضاحت کرتے تھے اور بالخصوص یونانی فلاسفہ کی موشگافیوں کا مُسکت جواب دیتے تھے۔ یہ حضرات متکلمین کہلائے اور اس علم اور فن کا نام ''علم کلام'' رکھا گیا۔

تاہم اس علم کلام کی خوبیوں کے ساتھ جو خلاء اور خامی تھی وہ یہ تھی ــــــــــ کہ اسلام کا دفاع کرنے والا کوئی ''متکلّم'' اگر کسی درجے میں ''ضعف بشری'' کے تحت مخالف عجمی نظریات سے متاثر ہو جائے ــــــــــ تو ایسا شخص اسلام کا دفاع کرتے کرتے ان نظریات کو آگے بڑھنے کا موقع فراہم کر رہا ہوگا بظاہر یہ صورت بڑی معصوم فطری اور بے ضرر لگتی ہے تاہم ــــــــــ اسی بشری کمزوری نے دشمن نے فائدہ اٹھا کر ہمیشہ اسلام کو نقصان پہنچایا کہ کوئی ایک شخص بظاہر ''اسلام کا محافظ'' بن کر اٹھا اسلام کے دفاع کے میدان میں کام شروع کیا معرکے سرانجام دیتے، نام پیدا کیا اور پھر آہستہ آہستہ عجمی نظریات کو پھیلانے اور عام کرنے میں اپنا رول ادا کرنا شروع کر دیا اور اہل اسلام کچھ عرصے کے لئے اس سے دھوکا کھا گئے اگرچہ ایسے حضرات کا کام جلد ہی اہل علم کی نگاہوں میں آ جاتا ــــــــــ تاہم امت کا ایک حصہ ضرور اس گمراہی کی رو میں بہہ جاتا ہے۔

اس طبقہ متکلمین میں بڑے بڑے نام ہیں اور انہوں نے بڑا کام کیا اگرچہ ایک حصہ فطری طور پر ــــــــــ کالی بھیڑوں پر بھی مشتمل ہے جنہوں نے دفاع کرتے کرتے یونانی اور عجمی نظریات کو عام کیا ہے۔

اس طبقہ متکلمین کی خامیوں اور بعض مسلمان فلسفیوں کے طرز عمل اور افکار کے نتیجے میں ردّعمل کے طور پر اور ANTITHESIS کے طور پر ایک بالکل دوسرا نقطہ نظر سامنے آ گیا اور وہ نقطہ نظر یوں تھا کہ اسلام کی تعلیمات اور ایمانی کیفیات نیز قرآن وحدیث کے دفاع کے لئے

ہمیں قرآن کی ظاہر تعلیمات پر کاربند ہونا چاہئے اور اس کی کوئی تاویل نہیں کرنی چاہئے اس طبقے کا اصول یہ طے پایا کہ ہمیں اسلام کا دفاع اپنے ''عقائد اور تصورات'' کے حصار میں رہ کر کرنا ہے کوئی مانے یا نہ مانے کسی پر اثر ہو یا نہ ہو، کوئی اسلام قبول کرے یا نہ کرے ہمیں اپنے عقائد و تصورات کے اندر ہی دفاع کا فریضہ سرانجام دینا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ ان کے بہت سے تلامذہ اور دیگر معروف اہل علم پہلے طبقہ میں سے تھے جبکہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ، امام بخاری رحمۃ اللہ وغیرہ ہیں دوسرے طبقے میں سے تھے بعد کے زمانے میں یہی دو طبقات، دو نقطہ ہائے نظر اور دو مکاتب فکر یا SCHOOLS OF THOUGHT کے طور پر تاریخ کے صفحات پر موجود ہیں۔

بنوعباس کی حکومت کے آخری دور میں اور سقوط بغداد کے فوراً بعد امام غزالی رحمۃ اللہ نے پہلے طبقہ کی نمائندگی کی ہے جبکہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ نے دوسرے طبقے کی اور ان دو عظیم ہستیوں میں شدید اختلاف، تنازع اور ان کے متبعین میں باہمی رنجش اور دوریوں کا سبب بنیادی طرز استدلال کا فرق ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ نے اس میدان میں اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے اپنے ماحول میں مسلمانوں کے جذبات کو جلا بخشی۔ عام حوصلے جو پست ہو چکے تھے۔ ان کو مضبوط کرنے کا کام کیا اور امت مسلمہ کے ایک بڑے حصے کو سقوط بغداد کے بعد شدید کچھاؤ اور پس ماندگی TENSION AND DEPRESSION سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ جزاہ اللہ عنا احسن الجزاء اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی وفات پر ان کا جنازہ ــــــــــ لوگوں کی دلوں کی دھڑکنوں کا اُمڈا ہوا سیلاب تھا جو شمار سے باہر تھا۔

درحقیقت آپ کے کارناموں میں ایک شعبہ تعلیم کے سلسلہ کو فروغ دینا تھا چنانچہ آپ کے ہزاروں شاگرد اور ہم خیال پیدا ہو گئے اور علمی میدان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ تھا جس کے

ذریعے ردّ بدعات ورسومات، بے عملی کے خلاف جہاد اور اپنے مخصوص انداز میں ایمانی کیفیات کا دفاع شامل تھا۔ مناظرہ اور چیلنج کے میدان میں فلاسفہ کے ساتھ پنجہ آزمائی رہی اور ان کے فلسفہ کے ردّ کے لئے ساری زندی سرگرم عمل رہے اور چھوٹی بڑی کئی تصانیف میں فلاسفہ کی بے بنیاد باتوں کا ردّ کر دیا ''الردّ علی المنطقین '' اس دور کے پس منظر میں حرف آخر ہے۔

آپ صاحب قلم بھی تھے، صاحب سیف بھی، لہٰذا جہاد کے میدان میں بھی صف اول پر رہ کر کام کیا ہے اور شہادت علی الناس کا وہ فریضہ جو ہر باصلاحیت مسلمان (عوام وخواص) پر ''فرض'' ہے کا حق ادا کر دیا۔

ذاتی حالات وکوائف

نام: احمد، لقب: تقی الدین، کنیت ابوالعباس۔ آپ کا سلسلۂ نسب یوں ہے: تقی الدین ابوالعباس احمد بن شیخ شہاب الدین عبدالحلیم بن ابوالبرکات عبدالسلام الحنبلی الحرانی۔

ولادت: آپ ملک شام کے شہر حرّان میں ربیع الاول 661ھ / جنوری 1263ء کو پیدا ہوئے۔

وفات: ذیقعدہ 728ھ / ستمبر 1328ء۔

آپ کے خاندان کے تمام افراد ''تیمیہ'' کی طرف منسوب تھے جس کی ایک وجہ یہ لکھی گئی ہے کہ آپ کی دُور کی ایک دادی کا نام تیمیہ تھا یہ اتنی بڑی عالمہ فاضلہ خاتون تھی کہ سارا خاندان اس کی طرف منسوب ہو گیا۔

چھ سال کی عمر میں والدین کے ساتھ دمشق منتقل ہو گئے، یہاں آ کر معروف علمی درس گاہ دار الحدیث السکریہ اور دیگر درس گاہوں کے اساتذہ سے صرف ونحو، منطق، ادب، فقہ، حدیث اور تفسیر وغیرہ مختلف علوم حاصل کیے۔ ابھی عنفوان شباب کے مراحل میں تھے کہ آپ کی ذہانت وقابلیت کے چرچے ہونے لگے، نوعمری میں ہی مذاکرات ومناظرات کی مجالس میں جب آپ علمی قابلیت کے جوہر دکھاتے تو بڑے بڑے علماء دنگ رہ جاتے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی عمر سترہ برس تھی کہ ان کے استاد قاضی شرف الدین المقدسی رحمہ اللہ نے مسندِ افتاء پر بیٹھنے کی اجازت دیدی، بائیس سال کی عمر میں حکومت نے انہیں دمشق کے عظیم مدرسہ دار الحدیث السکریہ میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز کر دیا۔ امام ابن تیمیہ نے جب اس مدرسہ میں پہلا درس دیا تو آپ کی

کے علم وفضل کی شہرت کی بناء پر علماء اور قاضی حضرات کی خاصی تعداد اس میں شامل ہوئی امام صاحب نے اس درس میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے اتنے معارف ونکات بیان کیے کہ سامعین حیران رہ گئے۔ امام صاحب کی تدریس کا انداز کچھ ایسا ہوتا تھا کہ کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ائمہ مجتہدین اور فقہاء کے اقوال بیان کرتے ہوئے جو قول حق کے مطابق سمجھتے اس کی دوٹوک حمایت کرتے اور اس کسی لومۃ لائم کا خوف نہ رکھتے' تقریر وتحریر اور خطبات وفتاویٰ میں بھی آپ کا یہی انداز تھا۔ چنانچہ 698ھ میں آپ نے ایک استفاء کے جواب میں ''عقیدہ حمویہ'' کے نام سے ایک تحریر لکھی جس میں متکلمین کے مذہب پر بھرپور تنقیدانہ جائزہ پیش کیا اور چونکہ بہت سے قاضی اور علماء متکلمین کے ہم خیال بھی تھے اس لئے عناد ومخالفت کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوگیا۔ نیز امام بن تیمیہ نے مشرکانہ رسومات اور بدعات کے خلاف بھی بھرپور جہاد کیا رجب اور شعبان کی بدعتوں پر تفصیلی کتابیں لکھی اور بعض بدعات کا خاتمہ کیا لوگوں کو جاہل واعظوں ان پڑھ مولویوں اور خودساختہ پیروں کے چکر سے نکال کر کتاب وسنت کی پیروی کا درس دیا۔ اس سلسلہ میں آپ کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا متعدد بار پابند سلاسل ہوئے لیکن زندگی کے آخری لمحات تک اس دعوت حق پر مستقیم رہے تا آنکہ انہی قید وبند کی صعوبتوں میں آپ نے اس دار فانی کو چھوڑ کر دار بقا کا رخ کیا۔

تصانیف

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے تفسیر، حدیث، فقہ، نحو، لغت، فلکیات، الجبرا، ریاضی، علومِ عقل ونقل اور تقابل ادیان کے موضوعات پر پانچ سو سے زیادہ کتابیں لکھیں چند مشہور کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

الکلم الطیب۔ المأۃ المنقاۃ من صحیح البخاری۔ قاعدہ فی اصول الفقہ۔ کتاب ابطال قول الفلاسفۃ بقدم العالم۔ مسئلۃ فی العقل والروح۔ العقیدۃ الحمویہ۔ مجموعۃ الفتاویٰ۔ الصارم المسلول علیٰ شاتم الرسول۔ رسالۃ فی الامر بالمعروف والنھی عن المنکر۔

گرامی قدر انجینئر مختار حسین فاروقی صاحب

السلام علیکم ورحمة الله

خیریت موجود و مطلوب

ماہنامہ حکمت بالغہ شمارہ اگست 2008ء کا حقیقت علم نمبر نظر نواز ہوا۔ اس شمارے میں مشاہدہ، تجربہ، عقل، ادراکیت، مقصدیت، فکر مغرب، مثالی معاشرہ اور تہذیب مغرب کے اثراتِ

بد کے مؤثر علاج کے موضوعات پر فکر انگیز تحریریں پڑھ کر بے حد لطف آیا۔

آپ نے مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان، یورپی استعماری طاقتوں کی ریشہ دوانیوں اور غلبۂ کفر کا مدلل جائزہ پیش کیا ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہم روتے تو ہیں مگر رونے کے اسباب کو دور کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ آپ نے جذباتیت کو ایک طرف رکھتے ہوئے خالص تحقیقی وسائنسی بنیادوں اور منطقی طرز فکر سے عقلیت اور آفاقیت کے ماحصل سے قاری کو نئے زاویہ سے سوچنے اور اصلاح کا راستہ دکھایا ہے۔

اس حقیقت سے مفر نہیں کہ مغرب کے اسلام دشمنی پر مبنی آدم بیزار فلسفے نے اپنی جڑیں گہرائی میں اتار رکھی ہیں جن کی بدولت سیاہ بختی کا عرصہ طویل ہوتا جارہا ہے۔ ان جملہ مسائل کا حل کتاب ہدیٰ کے اولین پیغام میں ہی پوشیدہ ہے اور حقیقت کی تلاش اس کا نکتۂ کمال ہے۔ اس کے لیے حواس خمسہ سے آگے بھی حصول علم کے ذرائع موجود ہیں مگر انسان تا حال ایک ہی خول میں بند ہے عہد حاضر میں فکری جمود کو توڑنے اور عملی اقدامات کرنے کی از حد ضرورت ہے۔

مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ آپ جیسی جہاں دیدہ اور کثیر المطالعہ شخصیت نے جنگل میں منگل کا منظر پیش کر کے حسن تحریر اور حسن بیان سے قارئین اور سامعین کو دعوت فکر دینے کا عزم کر رکھا ہے۔

میں آپ کی تعمیری سوچ سے متأثر ہوں کیونکہ آپ فکری انتشار کو جدید احیائے علوم کی تحریک کے ذریعے ایک فکر پر مجتمع کر رہے ہیں جس میں خود شناسی اور خدا شناسی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے' یہی بات اس تحریک کی روح ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس طرح بے کیف اور بدمزہ زندگی کی کھٹنائیوں سے نکل کر عشق الٰہی، عشق رسول، عشق قرآن، اتباع رسول اور فکر اقبال کو فکر وعمل کا مرکز ومحور بنا کر عالم انسانیت کو راہ ہدایت پر گامزن کیا جاسکتا ہے۔

آخر میں ایک بار پھر اس امر کا برملا اظہار کرتا ہوں کہ اس شمارے میں شامل مضامین اور موضوعات اور اسلوب بیان قابل داد ہیں امید ہے کہ ان فکری تحریروں سے آئندہ بھی سرفراز فرماتے رہیں گے۔ شکریہ

نیازمند

(صفدر علی شاہ)

پروفیسر گورنمنٹ ڈگری کالج جھنگ

بخدمت مکرم انجینئر مختار فاروقی صاحب

السلام علیکم ورحمة الله و برکاته

امید واثق ہے کہ آپ ایمان وصحت کی بہترین کیفیات میں ہوں گے۔''حکمت بالغہ'' کے خصوصی شمارے ''حقیقت علم نمبر'' کا تفصیل سے مطالعہ کا موقع ملا آپ کی یہ کاوش آپ کے چالیس سالہ مطالعہ کا حاصل بلاشبہ نہایت مفید اور وقت کی اہم ضرورت ہے۔

آج ہماری اکثریت جن مغربی علوم سے مرعوب اور شب وروز ان کے حصول کے لئے کوشاں ہے وہ کس قدر خطرناک اور بھیانک نتائج دے رہے ہیں۔ یہ علوم اخلاقی لحاظ سے تباہ کن ہیں اور ہمیں اپنے خالق و مالک سے دور کر رہے ہیں۔حقیقت علم نمبر سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے۔اس وقت صاحبان علم و دانش کو متوجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ آپ کے اس تجزیے کو عام کریں اور مغربی علوم کا تعلق علم الوحی سے قائم کر کے انہیں دنیا وآخرت کے لئے مفید بنائیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اس خصوصی شمارے کی اشاعت کو وسعت دے کر زیادہ سے زیادہ افراد کو مغربی علوم کے اس دجالی فتنے سے آگاہ کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ آپ کی اس کاوش کو شرف قبولیت بخشے۔(آمین)

والسلام

(خلیل الرحمٰن)

ریٹائرڈ پروفیسر گورنمنٹ کالج ٹوبہ ٹیک سنگھ

مغربی تہذیب

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف!
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف!

اے کہ می نازی بہ قرآن عظیم
تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم
در جہاں اسرارِ دیں را فاش کن
نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کن

فرمانِ خدا

(فرشتوں سے)

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقین سے کُنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیِ جمہور کا آتا زمانہ
جو نقشِ کُہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہ ہو روزی اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجود ے، صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغِ حرم و دَیر بجھا دو!

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سِلوں سے　　میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو
تہذیب نوی کارگہِ شیشہ گراں　　آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

.....

ماخوذ از ہفت روزہ ندائے خلافت' شمارہ 41(2008)

مغربی تہذیب کا اضطراب

آج مغربی دنیا کے اندر و باہر عداوت و چپقلش ہے، افراد، طبقات اور برادریوں میں.....کشمکش ہے، جنگ کے خوفناک بادل چھائے ہوئے ہیں، ایک آتش فشاں پہاڑ ہے جو کسی بھی معمولی سبب پر پھٹنے کے لئے تیار ہے، انسانیت کے حسرت ناک خاتمہ کی پرہول چیخیں ہیں، اعتماد، سکون اور جذباتی ہم آہنگی مفقود ہے، اعصاب اور دل و دماغ پر خوف و ہراس طاری ہے، ایک مسلسل اضطراب ہے، اخلاقی انتشار کا ناقابل قیاس طوفان ہے، ایک روحانی خلا ہے جو بھرتا نہیں، ایک مستقل مایوسی ہے جو لاعلاج ہے۔ یہاں صرف یاس و ناامیدی، بدشگونی، حیرت اور اضطراب کا عالم ہے۔

مغربی تہذیب کے اضطراب کی کہانی .....اس کی مستحق ہے کہ اسے بار بار بیان کیا جائے اور اس کی مستقل تکرار ہوتی رہے۔ یہ انسانی زندگی بلکہ اس کی تاریخ کا اہم ترین قصہ اور حکایت ہے، اس لئے کہ مشرق میں اب بھی کچھ ایسے لوگ ہیں جو اس تہذیب کی معصومیت اور اس کے ''تقدس'' پر ایمان رکھتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ اس جیسی تہذیبیں کبھی مٹ نہیں سکتیں، اور نہ کبھی وہ دیوالیہ ہوسکتی ہے۔ وہ اس عقیدت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی

(یہ تحریر دو عشرے یعنی بیس سال قبل کی ہے قارئین آج کی مغربی معاشرتی اضطراب کے تصور کے لئے اپنے طور پر اس شدت کو دس گنا فرض کرلیں)